دھواں
سفر
غلام جیلانی

آٹھواں سفر

(منتخب افسانے)

غلام جیلانی

طبع : اوّل
تعداد : پانچ سو
طباعت : اوم سائی گرافکس، نارائن گوڑہ
3-4-528 حیدرآباد (29)
تاریخ اشاعت : دسمبر ۱۹۹۳ء
کتابت : سید عبدالحمید
سرورق : سعادت علی خان
ناشر : مصنف
قیمت : (۵۰) روپے

اعانت : اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش - حیدرآباد۔
اہتمام : ادارۂ شعر و حکمت - حیدرآباد۔

ملنے کے پتے :-

(۱) سیل کاؤنٹر۔ روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ، حیدرآباد۔
(۲) 'سب رس' کتاب گھر، ایوانِ اردو - پنجہ گٹہ روڈ - حیدرآباد (۴۸۲)
(۳) کتب خانہ انجمنِ ترقی اردو، آندھرا پردیش - اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد۔
(۴) اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، اے سی گارڈس حیدرآباد۔
(۵) بزمِ ربانی، 3 RT /195 وجئے نگر کالونی - حیدرآباد۔ (۴۵۷)

میں نے زندگی میں جو بھی پایا ہے، اپنی والدہ اور
والد جناب غلام ربّانی صاحب (مرحوم) کی تربیت اور
شفقت کا فیض ہے۔
وہ ساری عمر دوست کی طرح میرے ساتھ رہے۔
آج بھی ہیں اور تادمِ آخر رہیں گے۔

افسانے لکھنا زمانہ طالب علمی سے شروع کیا۔ کوئی پندرہ بیس برس ہند وپاک کے تقریباً تمام موقر ادبی رسالوں میں میری کہانیاں شائع ہوتی رہیں پھر ایک عرصے تک میرے لکھنے کی رفتار بہت کم رہی۔ اس کی بڑی وجہ یونیورسٹی کی مصروفیات تھیں۔ اب ادھر پچھلے آٹھ دس برس سے یہ سلسلہ پھر شروع کر رکھا ہے۔ اور کوشش ہے کہ رفتار تیز رہے۔

اپنے ڈراموں کی طرح افسانوں کے پہلے مجموعے کو بھی شائع کرنے کا خیال اب آیا ہے۔ یہ افسانے بے سروسامانی کی حالت میں بکھرے پڑے تھے انہیں کتابی شکل میں مزیّن و یکجا کرنے میں شاید یہ خیال بھی کارفرما رہا ہے کہ اس طرح ان سے برتی ہوئی اپنی پچھلی بے اعتنائی کے احساس ندامت سے چھٹکارا پا جاؤں اور اگر ان کو پڑھنے کے بعد آپ نے پسند کیا تو سمجھوں گا' تاخیر کی تلافی ہوگئی۔

سرورق کے ڈیزائن کے لیے جناب سعادت علی خان کا' اور کتابت کے لئے جناب سید عبدالحمید کا ممنون ہوں' جن کا تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہا۔

غلام جیلانی

اُردو افسانے کا ایک معتبر نام

غلام جیلانی اردو افسانے کا ایک بھولا ہوا نام تھا۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے تک ہندوستان اور پاکستان کے معیاری ادبی رسالوں میں اس قلم کار کی تحریریں بڑے اہتمام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ وہ باذوق قارئین کا پسندیدہ افسانہ نگار اور ڈراما نویس تھا۔ پھر غلام جیلانی نے ادب سے ایک طرح کی کنارا کشی اختیار کر لی۔ قارئین کی وہ نسل بھی باقی نہ رہی جو اس کی تخلیقات کو ذوق و شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ گذشتہ چند برسوں سے یہ نام پھر رسالوں میں نمایاں طور پر شائع ہونے لگا۔ قارئین کو یوں لگا جیسے وہ بساط ادب کا کوئی نو وارد ہے جس کے فن میں بڑی صلاحیت اور پختگی ہے۔ جس کی تحریر بڑی منجھی ہوئی ہے۔

غلام جیلانی نے ماضی میں بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن اپنی کہانیوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں کرایا۔ ایسا ہوتا تو آج ادب کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہ ہوتے سال بھر پہلے ان کے ڈراموں کا مجموعہ "دوسرا کنارہ" شائع ہوا تو ایک اچھے اور بڑے ڈراما نگار کی حیثیت سے جلد ہی انہوں نے اپنی شناخت بنا لی۔ اب وہ اپنی منتخب کہانیوں کا یہ مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔ اس مجموعے میں گذشتہ دور کی انہوں نے چند ہی کہانیاں شامل کی ہیں۔ ایسی کہانیاں جو آج کی تحریروں سے کسی قدر میل کھاتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ ان کے پچھلے دور کی کہانیاں ناقابل اعتنا ہیں۔ ان میں کئی کہانیاں قدر اول کی

تخلیقات ہیں۔ لیکن ان کا مزاج اور اسلوب مختلف ہے۔ ان کہانیوں کا ایک علاحدہ مجموعہ شائع کیا جانا چاہیے۔ اس دور کی چند نمائندہ کہانیوں جیسے "اینی" "شام سے پہلے" اور "نیم کا پیڑ" کو اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے: یہ سدا بہار کہانیاں ہیں۔ ان میں زندگی کے ایسے تجربات کو موضوع بنایا گیا ہے جن کا تعلق انسان کے نفسیاتی اور سماجی رویّوں سے ہے۔

اُن دنوں پاکستان کا "نقوش" ہر سال ہند و پاک کے بہترین افسانوں کا انتخاب شائع کیا کرتا تھا۔ افسانے "نیم کا پیڑ" اور "اینی" اپنے اپنے سال طباعت کے انتخاب میں شامل رہے ہیں۔ "اینی" میں 'میڈیم' ایک بوڑھی اینگلو انڈین خاتون ہے، جس کی ساری عمر دکھ جھیلتے اور غم سہتے گذری ہے۔ فن کار نے اس کی تصویر الفاظ میں یوں کھینچی ہے۔

"میڈیم چھوٹے سے قد کی کمزور جسم والی عورت تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ فراک پہنتی تھی۔ جس میں سے سوکھے ہاتھ پیریوں نکلے رہتے، جیسے کسی ٹھنٹھ پر بچی ہوئی دو ایک ننگی شاخیں۔ گالوں کی ہڈیوں پر نکِل کے فریم کی عینک ٹکی رہتی جس کے اندر سے دو مغموم آنکھیں بجھتے ہوئے چراغوں کی مانند دھیرے دھیرے ٹمٹماتی رہتیں۔ اس کی بے رنگ آنکھوں کو غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا جیسے ان میں صدیوں کے غم اور دکھوں کی داستانیں جذب ہوں۔ بے پناہ غم کا یہی احساس اس کے چہرے پر جھریوں کے گہرے جال کو دیکھنے سے بھی ہوتا تھا۔ جیسے ان آنکھوں نے تمام عمر دکھوں کو دھارے بہا بہا کر چہرے کو سیراب کیا ہو۔ اور اب جب کہ یہ دھارے سوکھ گئے تو یہ سرزمین بھی خشک ہو کر تڑخ گئی اور بے شمار لکیروں کا جال چہرے پر چھوڑ گئی۔"

زیر نظر مجموعے کی بیشتر کہانیاں عصری احساسات و تجربات سے مملو ہیں۔ ایک خاص مشاہدہ اور تجربہ، ہجرت، بے وطنی اور بے زمینی کا ہے۔ یہ آج کے دور کا عالم گیر فنامینا ہے۔ نو آزاد ایشیائی ممالک کے باشندے اس کا خاص طور پر شکار ہوئے ہیں۔ کہیں سیاسی اسباب سے اور کہیں معاشی وجوہ سے لوگ ترک وطن کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ان میں

کثیر تعداد نوجوانوں کی ہے۔ اس کے نتیجے میں خاندانوں کے بٹوارے ہوگئے۔ رشتے ٹوٹ گئے۔ اور قدروں کا عظیم بحران پیدا ہوگیا۔ اپنے وطن میں رہ کر بے وطنی اور بے زمینی کا احساس بھی آج کی تیز رفتار زندگی کا المیہ ہے۔

غلام جیلانی نے اس عالمی صورت حال کے تمام سماجی، معاشی، اور نفسیاتی پہلوؤں کو اپنی کہانیوں میں بڑی فن کاری کے ساتھ سمیٹا ہے۔ قافلہ درد، تہہ در تہہ، ریزہ ریزہ مہک، اور 'آٹھواں سفر' اس کی عمدہ مثالیں ہیں، ان کہانیوں میں ان کا ردعمل نہ تو فلسفیانہ ہے اور نہ سماجی مصلح کا ہے۔ ان میں ایک دردمندی ہے۔ وہی دردمندی جو ہم کو میر کی شاعری میں محسوس ہوتی ہے۔

غلام جیلانی کی کہانیوں کے موضوعات متذکرہ بالا مسائل تک محدود نہیں ہیں۔ انھوں نے انسان کی داخلی کشمکش، نفسیاتی اور وجودی مسائل پر بھی عمدہ کہانیاں لکھی ہیں، جیسے ڈاکٹر احسان، بیرگام کا ڈاک بنگلہ، نجات کا لمحہ، دلِ زار وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ فنی تخلیق کسی موضوع کی اسیر نہیں ہوتی۔ فن میں موضوع محض بہانہ سخن ہوتا ہے۔ غلام جیلانی کی کہانی پڑھتے ہوئے ہم ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جس میں خارجی مشاہدات داخلی جذبات سے ہم آمیز ہو جاتے ہیں۔ غلام جیلانی ایک مشاق فن کار ہیں۔ وہ کہانی سلیقے سے بنتے ہیں۔ غیر ضروری تمہید کے بغیر وہ قاری کو کسی وقوع یا واردات کے دو بدو لے آتے ہیں۔ قاری میں ایک تجسس پیدا ہوتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ وہ خود بھی کہانی کار کا ذہنی رفیق یا ایک شخص قصہ بن جاتا ہے۔

وہ صفِ اول کے ڈرامانویس بھی ہیں۔ اور اس کا ثبوت ان مکالموں کی برجستگی اور دل نشینی ہے جو ان کی کہانیوں میں ملتے ہیں۔

غلام جیلانی کی کہانیوں کی ایک نمایاں خصوصیت کا ذکر کئے بغیر میری یہ مختصر سی بات ادھوری رہ جائے گی۔ اور وہ ہے ان کی زبان، جو سادگی، سلاست اور روزمرہ کے خوبصورت امتزاج سے مزین ہے۔ کردار اور واقعات کے لحاظ سے مقامی مروجہ الفاظ کا استعمال کہانی کا

بھرپور تاثر برقرار رکھتا ہے۔ اس کی عمدہ مثالیں ان کی کہانیاں "نیم کا پیٹر" "قافلہ درد" "نجات کا لمحہ" "ریزہ ریزہ مہک" اور "آٹھواں غر" ہیں۔

"نیم کا پیٹر" دلی کے پاس برج کے علاقے میں ایک گاؤں کی کہانی ہے۔ غلام جیلانی نے اس کہانی میں اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ زبان، محاوروں اور تشبیہوں تک میں مقامی رنگ اور الفاظ کا ایسا خوب استعمال کیا ہے کہ تاثر کی ایک مسلسل فضا شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔

"——— بنسی کو جب یقین ہو گیا کہ اب دیر تک نیند نہ آسکے گی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکیدار کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک اور کتوں کی چیخ پکار رات کی پراسرار تاریکیوں میں جذب ہو چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف کبھی کبھی نیم کے پرے سے چوپایوں کے جگالی کرنے کی آوازیں سنائی دے جاتیں، جیسے کوئی سروتے سے چھالیہ کتر رہا ہو۔

آہستہ آہستہ قدم دھرتا بنسی مویشیوں کے پاس چلا آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھک جاتے۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتے اور پھر جگالی میں مصروف ہو جاتے۔ ان کے آگے دھری ناندیں اور برانتیں چارے سے خالی ہو چکی تھیں۔ پھر بھی گوبر اور مینگنیوں کی مخصوص بو کے ساتھ نوہرے میں ابھی تک کھلی اور بھوسے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ چھپر تلے بنسی کے چہیتے بیلوں کی جوڑی بندھی تھی۔ جانے پہچانے قدموں کی چاپ سن کر وہ دونوں بدن جھٹک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خالی الاوندی میں منہ سے "فوں، فوں" کر کے بھوسہ اڑانے لگے

——— بنسی نے انھیں پیار سے تھپ تھپایا۔"

"ریزہ ریزہ مہک" داستانوی انداز میں آج کے تہذیبی بحران پر لکھی ایک خوبصورت کہانی ہے جس کی زبان میں داستانوی طرز ادا، الفاظ اور محاوروں کا استعمال بڑی سہانی کیفیت طاری رکھتا ہے۔

الفاظ کے محتاط استعمال کے ساتھ اثر آفرین رواں تحریر فن کاری کی ایک مشکل منزل ہے۔ غلام جیلانی نے اس منزل کو پا لیا ہے۔

مُغنی تبسّم

۲۱ اپریل ۱۹۹۳ء

اب گھر بھی نہیں گھر کی تمنّا بھی نہیں ہے
سوچا تھا کسی روز کہ گھر جائیں گے اک دن

(ساقی فاروقی)

قافلہ درد

——— دلّی سے بدرپور آنے تک ساری بس بھر گئی تھی۔

مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ میں اردگرد سے بے خبر، آنکھیں بند کئے، چٹان کی پھننگ پر معلق لٹکا ہوا، نیچے دیکھ رہا تھا، گہرائی میں۔ بارش میں بھیگ کر چٹان پر یکایک سبز کائی زندہ ہو کر بے حد پھسلواں ہو گئی تھی۔ اور اب کسی بھی لمحہ توازن کھو کر مجھے اس پر سے نیچے پھسلنا ہے ...... گرنا ہے۔ عجیب ہولناک کرب کی سرد لذّت میں دل ڈوبا جا رہا تھا ......

کنڈکٹر میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے مٹھی کھولی۔ بھینچے بھینچے نوٹ تڑ مڑ گیا تھا۔ کنڈکٹر نے بُرا سا منہ بنا کر لے لیا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"اپنے خوابوں کو قتل کرنے۔"

کنڈکٹر نے رک کر میری طرف دیکھا۔

"پلول" میں نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔

بقیہ ریزگاری ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس نے پھر ایک بار میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ اور پھر میرے برابر والے مسافر سے متوجہ ہو گیا۔ تین نشست والی بنچ پر میں سرے پر بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے لگی تیسری سیٹ پر ایک معمّر خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کو ٹکٹ تھماتے ہوئے کنڈکٹر بولا۔

"تمہارا اور ان کا ٹکٹ ایک ہی میں کر دیا ہے۔ وہ بھی پلول جا رہی ہیں۔"

جا رہی ہوں گی۔ میں ان باتوں سے بے تعلق ...... کوئی ہزار میل دور کی آوازیں

سن رہا تھا...... بیوی اور بیٹے کی آوازیں، جنہوں نے اسٹیشن پر اس بار بھی تاکید سے کہا تھا ـــــ "دلّی میں کام ختم ہوتے ہی لوٹ جانا...... سنا؟ پلول جانے کی مت سوچنا"۔

وہ ڈرتے تھے، میں وہاں جاؤں گا تو جذبات میں بہہ جاؤں گا...... پہلے ہی بلڈ پریشر کا مریض۔

مگر میں نے اس بار چپ چاپ طے کر لیا تھا۔

میں پلول جا رہا تھا۔ اپنے ان خوابوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے جو ہر بار مجھے کرب کے الاؤ میں دھکیل کر چلے جاتے ہیں...... کب سے پیچھا کر رہے ہیں میرا... ظالم...... سفاک۔

وہ خواب میرے پچھلے جنم کے ہیں۔

جب میں سترہ اٹھارہ برس کا تھا اور پلول سے کوئی ہزار میل دور رہتا تھا۔ ہر سال ابّا، امّی اور بھیّا کے ساتھ، گرمیوں کے دو تین مہینے گزارنے اپنے آبائی وطن، پلول ضرور جاتا۔ بلا ناغہ۔ مگر وہ سلسلہ یک لخت ٹوٹ گیا جب وہاں کے سب لوگ جبراً سرحد پار بھجوا دیئے گئے...... ہر بات ختم ہو گئی۔

میں پھر کبھی پلول نہیں گیا۔ سرحد کے اسی طرف رہتے ہوئے بھی۔ ڈوری کو قینچی سے یک لخت کاٹ دیا۔

مگر پلول برابر میرے ساتھ لگا رہا۔ بچپن کے دنوں کے پلول کی خوب صورت تصویر ذہن میں محفوظ رہ گئی...... وہ میرے پہلے جنم کی تصویر تھی۔

مگر پھر اس تصویر کی ایک ایک تفصیل نے خوابوں کا روپ دھار لیا...... اور پھر ساری عمر یہ خواب میرا تعاقب کرتے رہے۔ ہر بار جھیل میں پتھر پھینکتے رہے۔ میں سمجھتا رہا کہ وقت کے پاس پتھروں کا ذخیرہ ہی ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ذہنی ہیجان بھی۔

مگر اس کی بجائے جھیل کا پانی سوکھ گیا۔ اب پتھراؤ کو جذب کرنا مشکل ہو گیا۔

جھیل کی تہ پتھروں کے ٹکراؤ سے دہکنے لگی۔ ہر خواب کے بعد چین و سکون کرب

کے الاؤ میں لاوا بن کر بہہ جاتا۔

نیند غائب ہو جاتی۔ بستیوں کے پرے سے، کسی پُر اسرار پہاڑی کی گپھاؤں سے گھنٹوں کی مدھم آوازیں جگانے آجاتیں ۔۔۔۔۔۔۔ زخموں سے چُور، دکھوں میں ڈوبی ہوئی کراہیں ۔۔۔۔

اور پھر آخری پہر کے دَم توڑتے اندھیرے میں، میری ہستی کا ذرّہ ذرّہ بکھر جاتا ۔۔۔۔۔ گم ہو جاتا خلاؤں میں، وسعتوں میں۔

کیا کسی نے مجھے دیکھا ہے؟ ۔۔۔۔۔ کوئی نہیں بتاتا۔ کوئی ہے ہی نہیں وہاں ۔۔۔۔ سب میرے پاس سے جانے کب چپ چاپ کھسک گئے ہیں۔

خدایا کب تک اس عذاب کو جھیلتا رہوں گا؟ ۔۔۔۔ کب تک یہ خواب میرا تعاقب کرتے رہیں گے؟

میں سدھارتھ نہیں ہوں، نہ کوئی بودھیستوا ہوں ۔۔۔۔۔ مجھے ایک اور جنم کیوں دیا؟ ۔۔

آج برسوں کی ہمت جمع کر کے جا رہا ہوں۔ اس جنم کے خوابوں کی ہر کڑی کو توڑ کر اپنے ہاتھوں سے دفن کر دینے۔

اور اب بس فرید آباد سے گزر رہی تھی۔ مگر یہ کون سا فرید آباد ہے! آم کے باغوں کی ٹھنڈک اور مہندی کی باڑھوں کی مہک والی وہ صاف ستھری بستی کیا ہوئی؟

یہ سڑک تو بستی سے ہٹ کر جا رہی ہے۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں، گنجان کابک نما گھروندے، غلیظ موریاں، جوہڑ ـــــ اور ان کے پیچھے دور دور تک کارخانوں کے آتش فشاں ـــ دھواں اگلتی ہوئی چمنیاں ۔۔۔۔۔!

بے وقوف! ـــــ ان چالیس برسوں میں زمانہ قیامت کی چال چلتا ہوا تاریخ کے دو ڈھائی سو سال طے کر گیا ہے ـــــ تو کون سے دَور کی بات کر رہا ہے؟ ـــ اس کے تو نشان بھی ریت کے بگولوں نے ریگ زاروں کے سینے پر سے مٹا دیئے۔

وہ ٹھنڈک، مہک تو کبھی کی چمنیوں کا دھواں بن چکی ہے ـــــ دوڑ ۔۔۔۔ ہجوم میں شامل ہو جا۔ سڑکوں پر لوگوں کے سیلاب کے ساتھ بہتا جا ـــــ ورنہ اکیلا

رہ جائے گا۔ تیری لاش بھی کوئی نہیں اٹھائے گا۔ پیروں تلے روندتے سب آگے بڑھ جائیں گے

جھرجھری سی لے کر میں چونک گیا۔ بس اب فراٹے بھرتی ہوئی بلب گڑھ، اساوٹی

سے بھی آگے نکل آئی تھی...... میرے برابر والا دیہاتی جانے کہاں اتر گیا تھا ———

کھڑکی والی خاتون کھسک کر قریب آگئی تھیں۔

"بلول جارہے ہیں آپ؟"

——— کیوں پوچھ رہی ہے یہ؟ اسے تو معلوم ہی ہے۔ میرا ٹکٹ بھی اس کے ٹکٹ

میں شامل ہے۔

"کس کے یہاں جانا ہے بلول میں؟"

اس مرتبہ میں نے اسے مڑ کر دیکھا۔ مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتی ——— ؟

سفید بالوں کا جھنکاڑ ہوا کے جھونکوں میں الجھ کر ریت میں اٹ گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی

ذہین آنکھیں جھریوں کے جال میں پھنس کر رہ گئیں تھیں۔ کبھی ان میں چمک بھی رہی ہوگی...

اب تو وہاں غم آلود بوکھر کا زرد گدلا پانی جھلک رہا تھا ——— وضع قطع سے مہذب لگتی تھی۔

"کسی کے پاس نہیں ———"

شاید میرا لہجہ سرد تھا۔ خاموشی کی خلیج نے دونوں کو اپنے اپنے خولوں میں دھکیل دیا۔

بس کے اندر تھوڑے سے لوگ رہ گئے تھے۔ جاٹ اور گوجر عورتوں کی مسلسل

بھنبھناہٹ بھی دور سے آتی لگ رہی تھی۔ گھاگھروں، دھوتیوں اور پگڑیوں سے اٹھنے والے

میل اور پسینوں کے بھبکے بار بار پہلے جنم میں لے جاتے......

سڑک پر پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے کھیت خاصے ہرے بھرے تھے۔ پہلے سے

کہیں زیادہ زرخیز لگ رہے تھے۔

مگر پھر یہ بس کے اندر، باہر ——— سڑک کے کنارے بسے ہوئے دیہاتوں میں ہر طرف

اداس، مایوس چہرے، زرد، خوف زدہ سی آنکھیں کیوں ہیں؟ بڑے، بچے، بوڑھے سب بیزار

سے، زندگی سے بے تعلق سے کیوں بیٹھے ہیں؟

ان کھیتوں میں گیت اور قہقہے، حسن و عشق کی داستانیں.... کیا اب اگنی بند ہو گئی ہیں؟

"اس جگہ سڑک پر دونوں جانب بڑے پرانے تناور درخت ہوا کرتے تھے ..... بڑے .... ؟" یکایک میں ساتھ والی خاتون سے پوچھ بیٹھا۔

"گر گئے - کبھی کے۔ ایک بہت بڑی آندھی آئی تھی .... طوفان"۔

گر گئے ! ..... کیسے گر گئے ؟ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا، ان کی جڑیں زمین میں اتنی مضبوط ہیں کہ کبھی ہل بھی نہیں سکتے ..... مگر وہ گر گئے - !

وہ پہلے جنم کا واہمہ تھا ...... اور یہ اس جنم کی حقیقت۔

"آپ باہر سے آئے ہیں ؟ اُدھر ..... دوسری طرف سے ؟"

"نہیں - اِدھر ہی سے آیا ہوں"۔

وہ حیرت میں ڈوب گئی۔

"بہت دنوں بعد آئے ہیں ؟"

"چالیس برس بعد"۔

"تو اب وہاں کس سے ملنا ہے ؟"

"وہاں کے گلی کوچوں سے، فرش و دیوار سے ...."

وہ دیر تک خاموش مجھے تکتی رہی - اس کی آنکھوں کی گدلاہٹ اور زرد ہو گئی تھی۔

میرے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں اور میں انہیں زور سے بھینچتا گیا - یہاں تک کہ درد سے تڑپ اُٹھا۔

"اب کیا ملے گا دیکھنے کو ؟ کون سی گلی، کون سا فرش پہچان سکو گے ؟ سب کچھ بدل گیا ہے !"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا - دل میں ہلور سی اٹھی ...... پگلی - یہی تو دیکھنے جا رہا ہوں۔

"کون سا محلّہ تھا ؟"

"خیل - خیل کلاں"۔

وہ چونک گئی - "میر صاحب کا مکان؟" ..... اور پھر جیسے خود ہی جواب

پاگئی ہو۔" میں وہاں جایا کرتی تھی .... اوپر کا چوبارہ - پکا کوٹھا، کچا کوٹھا .... اندر اور باہر کا نوہرہ ...... سب یاد ہے مجھے۔"

زرد، گدلے پانی میں اُجلے نقطے سے جھلملانے لگے۔

"مگر تم ..... آپ کہاں رہے اتنے دن؟"

اب تمہیں کیا بتاؤں کہاں رہا! میں چپ رہا - وہ بھی خاموش ہوگئی۔ میری آنکھوں میں یوں دیکھے جارہی تھی جیسے کتاب کا کھلا صفحہ پڑھتی جارہی ہو۔

سنو - میں پہچان لوں گا۔ چالیس برس کے اُتھل پتھل کے باوجود مجھے سب یاد ہے ...... ٹیلے پر سب سے اونچا مکان' وہ اوپر چوبارے کی کھڑکی ...... باہر چوک میں پیر جی کا مزار جس پر نانا ابا ہر جمعے کو ایک مشک ٹھنڈے پانی کی چھڑواتے تھے ...... نیچے اتار پر اینٹوں کا فرش، پھر پتھروں کا چوڑا فرش ...... نواب صاحب کی کوٹھی، باہر والی مسجد، کنواں ...... اور پھر بستی سے نکلتے ہی شیر شاہ کے زمانے کی شاہراہ .... بسوں کا اڈہ .... حوض کٹورا اور میدانی کا قبرستان ......' ہمارا آبائی قبرستان ...... مجھے سب یاد ہے - وہاں کے موسم، بادل، درخت، فاختائیں، طوطے، ہریل، نیل کنٹھ، ہُدہُد .... ان کی آوازیں ...... انہوں نے کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔

"تو آپ اپنے کو دکھ پہنچانے آئے ہیں۔"

"نہیں - دُکھ کا ہمیشہ کے لیے گلا گھونٹ دینے کو ——"

وہ خاموش ہوگئی - کئی منٹ تک خاموش رہی۔

"سنیئے! میں ان دنوں کریمن ہوا کرتی تھی .... پھر ماں باپ نے غریبی سے تنگ آکر عیسائی مذہب اپنالیا - ہتین میں چرچ تھا نا، مشن کا؟ ...... ان لوگوں نے مجھے پڑھایا لکھایا، نرس کی ٹریننگ دی اور اپنے ہسپتال میں نوکر رکھ لیا ...... میں آپ کے گھر .... میر صاحب کے گھر انجکشن وغیرہ دینے بھی آیا کرتی تھی۔"

وہ پھر چپ ہوگئی - چہرے پر جھریوں کا جال تمتما سا گیا تھا۔

"پھر جب محلے خالی ہوگئے اور .... خالی گھروں میں لوگوں کے ریوڑ اُترنے لگے تو

میں کستوری بن گئی - لڑکے کو دلّی میں ڈاکٹری میں داخلہ مل گیا..... اب وہ اور اس کی ڈاکٹر بیوی یہیں سوہنہ روڈ پر ایک بڑا ہسپتال چلا رہے ہیں۔"

اور پھر چپ چاپ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی - "مگر...... اس وقت، آپ کے ساتھ بیٹھی ہوئی میں صرف کرمن ہوں؟"

یہ، کیسا امتحان ہے؟ ربر کو بھی کھینچتے جانے کی ایک حد ہوتی ہے...... میری انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔

"پلول اب نزدیک آ رہا ہے - آبادی کوئی دس گنی ہو گئی ہے - اور باہر باہر سے نئی سڑک نکال کر بسوں کا اڈہ اسی پر بنا دیا ہے - آپ میرے ساتھ یہیں اتریں گے - پھر میرے ساتھ رکشا میں چلیں گے..... پہلے میرے گھر - وہاں کچھ دیر آرام کریں گے - بیٹے اور بہو کے ساتھ کھانا کھا کر پھر چلیں گے..... آپ کے محلے نیل کی طرف......"

وہ اس اعتماد سے کہے جا رہی تھی جیسے میں 'نہیں' کہہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں نے کہا ضرور ——— "شکریہ، لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

"کاہے کا وقت نہیں ہے؟ اتنا وقت تو ضائع کر چکے! ..... چالیس برس کی تلافی کیا اس طرح آناً فاناً میں کر دینا چاہتے ہیں؟ ...... ایسی کون سی جلدی آن پڑی ہے؟"

اور پھر یک لخت چپ ہو گئی - شاید اپنے لہجے کی گرمی کو خود ہی بھانپ لیا تھا۔ مسکرا کر دھیمے سے بولی۔

"میں جانتی ہوں، آپ برا نہیں مانیں گے..... میں سب سمجھتی ہوں۔"

پھر ہم بس سے اتر کر رکشا میں چلے۔

"یہ اُدھر کربلا کا میدان تھا...... اب وہاں لاریوں کے کارخانے کھل گئے ہیں.. ..... اور یہ ادھر بھنگیوں کی بوکھر ہے - اب تک رہ گئی ہے ذرا سی۔"

"آگے مینار دروازہ ہے...... ہے نا؟" یکایک میں نے پوچھا۔

"ہاں جی ———" یہ جواب رکشا والے کا تھا۔

سڑک چھوٹی اور تنگ ہو گئی تھی - دکانیں اُبل پڑی تھیں...... فاصلے ذرا سے

لگ رہے تھے ۔ ہر گھر میں کئی کئی خاندان آباد ہو گئے تھے ...... اجنبی چہرے، اجنبی آوازیں .....

رکشا پرانے تھانے کے پاس رک گیا - دائیں ہاتھ وہ پتھر والا فرش جاتا تھا، اوپر چڑھائی کی طرف ...... ہماری حویلی کو ۔ میں رکشا سے اتر گیا ۔ اس نے کرایہ بھی نہیں دینے دیا ۔ ہاتھ تھام لیا ۔

" اگلی دفعہ ...... آپ پہلے ہمارے یہاں آئیں گے ..... سیدھے ...... وہ آگے نیم کے برابر سے جو سڑک مڑتی ہے ۔ "

" جانتا ہوں ۔ وہی سوہنہ روڈ ہے ۔ "

" اسی پر ہمارا گھر ہے ...... بیٹے کا ہسپتال " ۔

" اچھا ...... خدا حافظ ...... اور شکریہ ! "

وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی ۔ شاید مجھے شکریہ نہیں کہنا چاہئے تھا ـــــ اور پھر رکشا آگے بڑھ گیا ۔

میں دائیں طرف فرش پر چلنے لگا ۔ کچا پکا بکھرے ہوئے گھروں میں غم آلود سناٹا تھا ...... فاصلے سکڑے ہوئے ...... ہر شئے کی ہیئت بدلی ہوئی سی ...... کوئی آشنا نہیں ۔ کسی نے میرا استقبال نہیں کیا ۔ نہ راستوں نے، نہ گھروں کی دیواروں نے ...... نہ پرندوں کی آوازوں نے ۔ اینٹوں کے فرش کا موڑ آ گیا ۔ یہاں نکڑ پر کلو نائی کا گھر تھا جو ہر سال تاج محل کی شکل کا بہت خوبصورت ایک تعزیہ بناتا اور محرم کے دن اپنے ہی ہاتھوں سے کربلا کے میدان میں لے جا کر اسے مٹی میں دبا آتا ...... دو دن تک چبوترے پر بیٹھا روتا رہتا ۔ اور تیسرے دن سے اگلے سال کا نیا تعزیہ بنانا شروع کر دیتا ۔

یہاں اب کون رہتا ہے ؟ ـــــ ٹھیکر والا سے آیا ہوا کوئی شرنارتھی خاندان ۔ میں بیٹھک میں چلا گیا ۔ ہم لوگ وہاں چناب کے کنارے مٹی کے کھلونے بناتے تھے اور بابو جی ..... یہاں بیٹھک میں ایک ادھورا تعزیہ اب تک جوں کا توں رکھا ہے ...... کاغذ اور پنّی پھٹ گئے ہیں ۔ مگر ...... کھپچیاں ویسی ہی ہیں ۔

ـــــ تو جوں کا توں کہاں ہوا ؟

میں فرش پر اوپر چڑھتا گیا ۔ یہ ہمارے گھر کا راستہ تھا ۔ سارے گھر بدل گئے تھے ۔

ہمارا گھر بھی ..... مگر نہیں — اوپر چوبارے کی کھڑکی ابھی تک ویسی ہی تھی ..... یہی ہے ہمارا گھر۔

کھڑی دوپہر میں نانی اماں کچےّ کوٹھے میں سارے بچوں کو دبوچ کر سلا دیتی تھیں۔ مگر میں بہانہ کرکے پڑا رہتا اور موقع ملتے ہی تکیئے کے نیچے سے چونی چرا کر باہر بھاگ جاتا ..... ملائی کی برف بیچنے والا شاید میرے انتظار میں بیٹھا رہتا ...... برف کھا کر میں اوپر چوبارے والی کھڑکی میں بیٹھ جاتا ...... اور تاگے میں ٹھیکری باندھ کر نیچے لٹکاتا۔

میں اتنی باتیں یاد کر رہا ہوں ..... اور وہ کھڑکی پہچان بھی نہ سکی مجھے!.... بالکل اجنبی، غیر کی طرح دیکھ رہی ہے ....، شاید خفا ہے ..... کہاں چلا گیا تھا؟

دل برداشتہ میں لوٹ گیا۔ چوبارے کی کھڑکی نے یا چاروں طرف سہمے ہوئے سنّاٹے نے ..... میرے دل کی دھڑکنوں کو تیز نہیں کیا۔ نہ سانسوں کی رفتار بدلی۔ لمحے گزرتے گئے ...... اسی طرح جیسے ہمیشہ گزرتے ہیں۔

——— اور پھر اسی وقت واپس ہو گیا۔ دلّی جاتے ہوئے بس میں میں خوش تھا کہ آج اپنے خوابوں کی آگ میں سے گزر کر اسے ٹھنڈا کر دیا ہے ..... ہمیشہ کے لیے۔ کتنا مشکل سمجھے ہوئے تھا اسے! ......، کتنا خوف زدہ تھا! کتنے برس انتظار کیا تھا اس لمحے کا!.... لیکن کیا یہ لمحہ بھی میرے انتظار میں تھا؟

——— وہ مشترک ٹکٹ ...... سفید بالوں کے جھنڈ کاڑوالی کریمن ......؟ یہ مختلف تعددوں میں اہتزاز کرنے والے لمحے، ایک جگہ کیسے اکٹھے ہو گئے ———؟

اور پھر میں دلّی سے بھی واپس آ گیا۔ ایک ہزار میل دور ...... اپنے شہر میں۔

ٹھیک گیارہویں دن میں نے خواب میں پھر بلول دیکھا ...... بچپن کا بلول!.... .... وہی دیوار و در ...... وہی موسم، وہی پرندوں کی پروازیں ..... ان کی بولیاں ..... میرا پہلا جنم۔

وہی آگ .... وہی لاوا .... مگر میں تو بڈھا نہیں ہوں۔ بوڑھا ہونا تک نہیں۔

▲▲
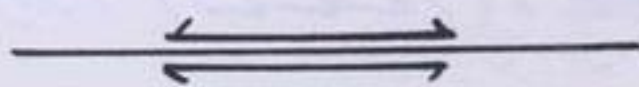
اکھڑے ہوئے لوگ

جب روشنیوں کے نقطے بھی اندھیروں نے نگل لئے تو کشتی میں کوئی بولا ــــ

ــــ " اب ہم نکل آئے ہیں " ــــ

کشتی کے اندر مکمل اندھیرا تھا، اندھیرا اور خاموشی ۔ رتی برابر روشنی پر بھی گولیوں کی بوچھار شروع ہو جانے کا خوف بدستور طاری تھا۔ بس انجن کی چھگ چھگ اور کشتی سے ٹکرانے والی موجوں کی لپ لپ کے سوا، کوئی اور آواز نہیں تھی ۔ اندھیرے اور سناٹے کی دبیز دیوار تلے سارے مسافر دم سادھے، سر نیوڑھائے، خوف کی چادر میں لپٹے یوں بے حس و حرکت بیٹھے تھے کہ جیسے بھول چکے ہوں، وہ زندہ بھی ہیں۔

یکایک کسی نے جواب دیا ــــ "بے وقوف مت بنو ۔ رائفل کا رینج تم جانتے ہو ؟"

" ششش ..... ش ..... ش "

اور پھر بس چھگ چھگ اور لپ لپ ۔

وہ سب کوئی پچیس سے زیادہ نہیں تھے ۔ حالانکہ ان کے چھوٹے سے گاؤں کی آبادی سو سے کم نہیں تھی ۔ مگر کچھ من چلے، جوشیلے نوجوانوں نے گاؤں چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور کئی ضعیف آدمیوں کو، جو آنے کے لئے کمر باندھے تیار بیٹھے تھے، نوجوانوں نے لانے سے کترا کر وہیں چھوڑ دیا تھا۔

وہ لوگ تڑکے، بھور کی پہلی سفیدی کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے۔ سارا دن گھنے جنگلوں میں سے درانتیوں گنڈاسوں کی مدد سے، بیلوں اور شاخوں کو کاٹ کاٹ کر چلتے رہے۔ اونچے درختوں کے سایوں میں دلدلیں چھپی ہوئی تھیں۔ اور جہاں دلدلیں نہیں تھیں، وہاں لمبے نکیلے کانٹے چپلوں کے تلوؤں میں گھسے جاتے تھے ——— پھر بھی وہ چلتے رہے۔ اسلئے کہ چلتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا!

اندھیرا ہونے سے پہلے انہیں ساحل تک پہنچ جانا ضروری تھا۔ ورنہ پھر کشتی کا انتظام کون جانے کبھی ہو گا بھی یا نہیں!

وہ لوگ سستانے، یا کچھ کھانے پینے کے لئے بھی نہیں رکے، بس کبھی کبھی رفتار سست کر کے سانس درست کر لیتے ——— اور بس۔ سب ایک ہی گاؤں کے تھے، اور سب نے مل کر ہی نکل چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اس وقت سب اجنبی بنے ہوئے تھے۔ کسی کو کسی کی فکر نہیں تھی۔ بس اپنی ——— صرف اپنی فکر تھی۔

سب چپ تھے۔ کھسر پھسر کرتے بھی ڈر رہے تھے۔ کہیں کسی کو پتہ نہ چل جائے! راستے میں کہیں کوئی گاؤں پڑتا تو یہ لوگ دور ہی سے کترا کر نکل جاتے۔

——— وہ کالا کلوٹا، ناٹے قد والا، ان سب کا راہبر تھا، جس کے سر پر سفید پگڑی تھی۔ اور جس نے پینچی کو اوپر رانوں تک اڑس رکھا تھا۔

کسی کو سامان ساتھ لے چلنے کی اجازت نہیں تھی ———

"جانیں بچانی ہوں تو چھڑے چھانٹ چلنا ہو گا ——— سمجھے؟" اس نے کہا تھا۔ اور بس زیادہ سے زیادہ ایک ایک چھوٹا سا بیگ ان لوگوں نے لے رکھا تھا۔ اس سوکھے سوکھے ہاتھ پیر اور لمبے بالوں والے نوجوان نے تو بس ایک گٹار ساتھ رکھی تھی۔ اس کی غلافی آنکھیں سدا مسکراتی لگتی تھیں۔ اسی لئے کوئی ان کو راست دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، ——— پتہ نہیں وہ اسی پر ہنس رہی ہوں!

بس ایک جگہ، ایک چھوٹے سے گاؤں سے بچ کر نکلتے وقت انہیں تھوڑی دیر کے لئے رک جانا پڑا تھا۔ اناس اور ناریلوں کے جھنڈ تلے ایک نوجوان ان کے انتظار میں کھڑا تھا،.... اپنے کتے کے ساتھ۔ یا پھر وہ سندری اس کے انتظار میں تھی، جو اپنے پتا کے ساتھ اس قافلے میں آرہی تھی۔ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ اور کتا دم ہلانے لگا۔

"وہ ہمارے ساتھ نہیں چلے گا۔ وہ دوسرے گاؤں کا ہے۔"

"وہ کوئی جاسوس نہیں ہے" سندری کا پتا بولا "—— وشواس رکھو۔ وہ میری بیٹی کے لئے اپنا پریوار چھوڑ کر آگیا ہے...... ساتھ ہی چلے گا۔"

"مگر اس کا پریوار..... ؟"

"چنتا مت کرو —— اس نے کسی کو بتایا نہیں ہے"

اور پتا کی آنکھوں میں وشواس کی جھیل نے سب کے خوف اور شبہے جذب کر لئے۔

قافلہ پھر اسی طرح چلنے لگا —— خاموش۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم۔

—— اپنا وطن چھوڑ کر انہوں نے ٹھیک کیا یا —— ؟ اور خوف کی برفیلی چھری جسم میں اترتی چلی جاتی۔ مستقبل کی تشویش، بے یقینی، بے تحفظی کا کہرا ذہن کو لپیٹ لیتا۔ —— وہ کہاں جا رہے ہیں ؟

"ہم اپنے وطن جا رہے ہیں۔" کسی نے کہا تھا، نکلنے سے پہلے۔

"سالے۔ وطن تو اپن کا یہی رہ ہے۔"

"اے نئی اے رہے۔ اپن کا ملک، ادھر سمندر پار ہے۔"

"نئی جی —— یہی رہ ہے۔ اپن یہیں رہ جنم لئے رے نا ؟"

"پر اپن کے گرینڈ فادرس اُدھر سے آئے تھے ——"

"وہ ہزاروں برس پہلے آئے ہوئیں گے —— اب کی بات کیوں نہیں کرتا رے ؟ —— ہر ملک میں دوسرے ملک کے لوگ آتے رہے... بستے رہے..... ہے نا ؟"

"تیرے کوئی آنا رے، نئی آ ___ تکرار نکو کر، یہیں پچ رہ کو مر.....
اپن کو مرنا نئی رے۔"

مگر رہا کوئی بھی نہیں۔ کیوں کہ مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ مگر وطن والی بات اب بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی اس کے ___ وہ وطن چھوڑ رہا تھا..... یا وطن کو جارہا تھا؟

گھنے اور اونچے پیڑوں کے ہاتھی کے کان جیسے پتوں نے نیچے زمین پر بکھرے پتوں اور شاخوں کے فرش پر سایہ کر رکھا تھا۔ کہیں کہیں سورج سے اگلی آگ کا ایک آدھ تیر شاخوں کے جال کو چیر کر نیچے چلا آتا تو جسموں میں پیوست ہو جاتا۔ جیسے آتش بازی کے انار سے اچھٹی کوئی چنگاری دور تک چلی آئے ___ اور پھر کہیں یکلخت پتہ چلتا کہ ان کے جسم بیلوں اور شاخوں میں پھیلے ہوئے مکڑی کے جالوں میں الجھ گئے ہیں۔ آگے بڑھتے تو ٹھٹک کر کھڑے رہ جاتے ___ ڈراونی شکل اور دیو قامت والی کوئی مکڑی ہوا میں جھولتے جھولتے رک کر، اپنی بڑی اور گول گول آنکھوں سے غصے میں انہیں دیکھنے لگتی ___ ہتیلی کے برابر بڑی، ہاتھوں اور پیروں پر اور پیٹھ پر سیاہ نکیلے بال کھڑے کر لیتی۔ اور عورتوں کی چیخ نکل جاتی۔ اور وہ کالا کلوٹا، پیچھی والا ڈانٹ کر انہیں چپ کرا دیتا۔

تیسرے پہر، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر، دو تین مرتبہ فائرنگ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ سب لوگ دم سادھ کر جہاں کے تہاں زمین پر پڑ گئے اور جب اطمینان ہو گیا کہ گولیاں کہیں دور چلی تھیں، تو قدم پھر بڑھنے لگے..... شام تک ساحل پر پہنچنا تھا۔

اور اس وقت پتہ چلا کہ ان میں سے ایک ابھی تک زمین پر دبا پڑا ہے، جہاں دبک کر چھپا تھا۔ قدم رکنے لگے تو کسی نے کہا ___

"رکو مت۔ اسے کالے ناگ نے کاٹ لیا ہے۔" سب سن سے رہ گئے۔

قدم زمین میں گڑ گئے ——— "چلتے چلو ...... میں نے خود دیکھا تھا"۔

کچھ دور سب چپ چاپ چلتے رہے ...، کھوئے کھوئے سے۔ ہر قدم انہیں گھر سے دور لے جا رہا تھا۔ یکایک کوئی بولا:

"گولیاں کس نے چلائی تھیں؟"

"دشمنوں نے" کسی نے جواب دیا۔

"نہیں۔ وہ اپنے سپاہی تھے۔" کوئی اور بولا۔

"اپنے؟ ——— ہونہہ!" اور ایک ہذیانی ہنسی کا فوارہ چھوٹا۔

"کون اپنا ہے، اور کون دشمن ——— کیا تو جانتا ہے؟ ...... سالا۔"

"کوئی اپنا نہیں ———" پھولے ہوئے سانسوں اور کھانسی کے جھٹکوں میں الجھی کوئی ضعیف آواز آئی ——— "نہ وہ جو آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ اور نہ وہ ...... جو ہمیں بچانے آئے ہیں۔"

سب چپ ہو گئے۔ مگر پھر وہی آواز آئی ——— "گولیاں کس نے چلائی تھیں۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم دونوں کی زد میں ہیں۔"

"بے وقوفو ...... حرامیو، چپ نہیں رہ سکتے؟"

"میں تو سوچ رہا تھا گولیاں کس نے ......"

"ششش ...... ش ...... سوچ رہا تھا، ...... الو کے پٹھے۔ سوچنا تو سارے ملک میں کب کا بند ہو چکا ہے! ...... تجھے سوچنے کی پڑی ہے تو مر جا کے ...... جا ...... جا"

——— اور پھر وہی ہذیانی قہقہے کا فوارہ چھوٹا۔

——— اور پھر جب گھنے جنگل اور پہاڑوں کی دیوار کے پیچھے سے سمندر کی بو اور آواز آئی تو ادھ مرے چہروں پر زندگی کی پھوار برسی۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا ——— آنکھوں کے کنوؤں میں امید کی لو پھر ٹمٹمانے لگی ———

مگر وہ، جس کے دل میں گھر سے نکلتے وقت سرد چھری اترتی چلی گئی تھی پھر ایک بار ہول کی برفیلی لہر میں منجمد ہو کر رہ گیا —— کیا اب سچ مچ چلا جانا پڑے گا —— !'

مگر وہ چپ رہا۔ اپنے ساتھیوں سے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ جو صبح کو نکلتے وقت دوست تھے اس وقت وحشی درندے لگ رہے تھے۔ کھنچے ہوئے تار کا تناؤ انسانیت کے سوتے بند کرتا جا رہا تھا۔ اور پھر سوچنا تو سب نے کب کا چھوڑ دیا تھا!

"چلو۔ سب جا رہے ہیں" —— اس کے کان میں پھر وہ آواز گونجی

"مگر کہاں .... اور کیوں؟"

"پوچھو مت، یہ ملک چھوڑ دینا ہے۔"

"مگر یہ تو اپنا گھر ہے۔"

"اب نہیں ہے —— کل صبح ہم سب جا رہے ہیں"

"کہاں؟"

"اپنے ملک"۔

"مگر وہ اپنا ملک کہاں؟ —— میں تو یہیں پیدا ہوا تھا .... میرا باپ بھی ...... اور اس کا۔"

"بکواس مت کرو۔ کل صبح پو پھٹنے سے پہلے ......، نہیں تو اکیلے مرنا پڑے گا۔"

"ہم اکیلے نہیں مریں گے بابو ——"

"نہیں ۔ اکیلے نہیں، سب کے ساتھ مریں گے۔" اور ساری رات گاؤں بھر کے ساتھ انہوں نے بھی آنکھوں میں کاٹ دی۔

اور اب چٹانوں پر سر پٹکتی لہروں کا شور کان پھاڑے ڈال رہا تھا۔ سمندر کی بھیگی اور مخصوص بو نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کچھ دور ریت کا ساحل بھی تھا۔

مگر کشتی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

اور سورج پہاڑوں کے پرے اترتا جا رہا تھا۔

اور ساگر کی نیلاہٹ میں سبز رنگ گھلتا جا رہا تھا۔ اور جہاں دونوں نیلاہٹیں ایک ہو گئی تھیں، وہاں سے آبی پرندوں کی قطاریں ساحل کو لوٹنی شروع ہو گئی تھیں۔

مگر کشتی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ سب جہاں کے تہاں، چپ چاپ بیٹھ گئے۔ سندری اور وہ نوجوان، اور کلّو بھی۔ مگر جو سوال سب کے ذہنوں میں دہک رہا تھا، کسی کی زبان سے امڈا نہیں۔

"مگر اس کو آجانا چاہیئے تھا"۔ بونے قد والا بولا ——— "ادھر جگہ بھی یہی ہے"۔

اور جگہ وہی تھی۔ کشتی بھی آچکی تھی۔ ملاح نے اسے چٹانوں کی آڑ میں چھپا رکھا تھا۔ اب جو نکال کر سامنے لایا تو سب دوڑ پڑے۔ ہر ایک کو کشتی میں پہلے بیٹھنے کی جلدی تھی۔ پانی میں گرنے اور بھیگ جانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔

پیٹی والے کلوٹے نے ملاح کو نوٹوں کی گڈّی بتائی اور جلدی سے موٹر اسٹارٹ کرنے کے لئے چیخنے لگا ——— 'جلدی .... جلدی ....'

اور جب چھگ چھگ کی آواز میں کشتی سرکنے لگی تو سندری چیخ اٹھی۔ نوجوان کو کلوٹے بونے نے کشتی میں آنے نہیں دیا تھا۔ وہ ساحل پر ہی کھڑا تھا، اور اس کے بھی پیچھے دور، اس کا کتّا۔

"نئی .... باپو۔ اس کو بٹھاؤ۔ نئی تو میں بھی نئی جاؤں گی"۔

"——— اور پھر اس نے روپے بھی نہیں دیئے"۔ پیٹی والا ملاح کو سمجھا رہا تھا۔

مگر ملاح جانتا تھا، یہاں تک آکر وہ واپس اپنے گاؤں زندہ نہیں پہنچ سکتا۔ ادھر کشتی میں اس دفعہ اس نے زیادہ ہی لوگ ٹھونس لئے تھے .... جھال میں مرغیوں کی طرح۔ پھر بھی اس کے دل نے پسیجنے کے لئے زیادہ وقت نہیں لیا۔

"بلا لو اسے بھی .... سالا۔ یاد کرے گا زندگی بھر"۔

مگر جب کشتی میں چڑھنے لگا تو نوجوان کو کتے کا خیال آیا، جو دور ساحل پر بیٹھا دم

ہلا رہا تھا۔ اور وہ اسے بلانے کے لئے لوٹ گیا۔

"نہیں ـــــ کتا نہیں۔" ملاح چیخا۔

اور سندری چیخی ـــــ "واپس آجاؤ انتم ـــــ"

مگر انتم کتے کو بلاتا رہا۔ اور کتا پتہ نہیں کیوں؟ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ اب اس نے

پلاٹ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا...... اور کشتی دور ہوتی جا رہی تھی۔

اور اسی وقت ایک گولی چلی، اور انتم ساحل کی خشک ریت پر ڈھیر ہو گیا۔ کتا بے قرار

ہو کر کوں کوں کرتا، انتم کے پاس آیا ـــــ ایک اور گولی چلی۔ اور کتا بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔

کشتی دور ہوتی جا رہی تھی۔ اور سندری کی چیخیں بھی۔ گولیاں بھی برابر چل رہی

تھیں ـــــ

تھوڑی تھوڑی دیر میں کوئی بڑی سی لہر ریت پر دور تک دوڑ جاتی تو نوجوان اور اس کے

کتے کو نہلا کر ساگر میں لوٹ جاتی۔

کشتی دور ہو گئی تھی ـــــ

کون کتنا زخمی ہوا تھا..... زندہ بھی تھا یا مر چکا تھا، کسی کو خبر نہیں تھی، اور نہ یہ

فکر تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا...... اور سب کو فکر تھی تو یہ کہ جلد سے جلد اندھیرا انہیں

نگل لے۔

اور جب اندھیرے نے انہیں پوری طرح ڈھک لیا تو بھی ڈر کے مارے کسی نے بیٹری تک

نہیں جلائی۔ سب کو اپنی فکر تھی۔

اور پھر اسی اندھیرے میں ملاح اور کالے کلوٹے نے مل کر ان سب کو سمندر میں لڑھکا

دیا جن کو گولی لگی تھی۔ ملاح نے کہا کہ دیکھنے کی ضرورت نہیں، وہ مر چکے ہیں، یا صرف زخمی

ہوئے ہیں۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ اس کام میں ان کی مدد کشتی کے دوسرے مسافر بھی کرنے لگے۔

اور اب دور اندھیرے میں ساحل کی طرف کچھ روشنیاں نظر آرہی تھیں ۔ کشتی کو ملاح نے سمندر میں کچھ اور اندر کی طرف دھکیل دیا ۔ انجن کی چھگ چھگ بھی دھیمی کر دی، سمندری کی ہچکیاں بھی بند کروا دیں ـــــ

اور جب روشنیوں کے نقطے بھی اندھیروں نے نگل لیے تو کشتی میں کوئی بولا ـــــ

ـــــ " اب ہم نکل آئے ہیں "۔

'کیا ہم نکل آئے ہیں ؟' ـــــ مگر وہ پھر چونک گیا ۔ سوچنا بند ہو چکا ہے، یہ بات اسے ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے ۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔

بس خاموشی ۔ اور موٹر کی چھگ چھگ ، جس کے بغیر خود خاموشی غیر مکمل لگتی تھی ۔

تاروں کی چھاؤں میں، اور سمندر کی نمی میں بھیگی ہوا کے جھونکوں میں، لوگ اونگھنے لگے ۔

.... سو بھی گئے تھے ۔ صبح سے نکلے، جسم اور ذہن تھکن اور خوف سے بے جان ہو چکے تھے ......

بھوک اور پیاس کا بھی ہوش نہیں رہا ۔

کبھی کوئی ذہن یکبارگی نیند جھٹک کر بیدار ہو بھی جاتا تو وہی برفیلا خوف اُسے پھر منجمد کر دیتا ـــــ وہ کہاں جا رہا ہے؟ ـــــ کیوں جا رہا ہے ؟ آگے کیا ہے ؟ ـــــ اور گرداب کا مرکزہ آپ ہی آپ اسے اندر ہی اندر کھینچ لیتا ـــــ گھسیٹ لیتا، نگل لیتا ۔

ـــــ پچھلے پہر ستاروں کے چہرے فق ہو چلے تھے ۔ زہرہ کی آنکھ سے بھی یرقان زدہ دہشت ٹپک رہی تھی ۔ سہمی سہمی ہوا کے نوحوں میں بس وہی موٹر کی چھگ چھگ ......

حالاں کہ افق پر پھر ایک نئی صبح کی تیاریاں شروع ہو رہی تھیں ۔

اور کچھ ہی دیر بعد جیسے جیسے آسمان کی پیشانی پر یکے بعد دیگرے ساتوں رنگ جھلکتے گئے، سمندر کے پانی بھی رنگوں کی پنسلوں سے اپنے روپ کی نوک پلک سنوارتے گئے ۔

ـــــ اور آخر میں اپنی نیلاہٹوں کی کروٹ کروٹ میں چاندی کی کرچیں بھر دیں ۔

مگر کشتی کے مسافروں کے چہروں پر سے دہشت کی زردی نہیں جا سکی ۔ اب ان کے

دلوں میں آنے والے لمحوں کا خوف تھا۔ مستقبل کی تشویش تھی۔

اپنا دروازہ بند کر کے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کنڈی لگا دی تھی ــــــ وہ گھر اب غیر ہو چکا تھا۔ اب ایک نئے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانی ہے، تو کیا .... یہ گھر غیر نہیں ہوگا؟ .....

لمحہ بہ لمحہ وہ گھر کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

سورج کی بھٹی میں ایندھن بڑھتا جا رہا تھا، اور دھرتی کے سینے پر زندگی کھیلتی جا رہی تھی ...... بس سمندر، اور موٹر کی چھگ چھگ! کہیں وہ راستہ تو نہیں بھٹک گئے تھے!

مگر اسی لمحے انہیں افق پر حرارت کی لہروں کے غبار میں آلودہ عمارتوں کے سرے نظر آنے لگے ــــــ وہ لمبا چوڑا اور اونچا شہر جس کا دل بھی اتنا ہی بڑا تھا ــــــ جہاں انہیں جانا تھا۔ جہاں ان سے پہلے بھی ہزاروں خاندان پناہ لے چکے تھے ــــــ ان کا نیا گھر ــــــ

کشتی بڑے شہر کی طرف سہمی سہمی، سمٹی سمٹائی یوں بڑھ رہی تھی جیسے کوئی دیہاتی پہلی بار شہر آ رہا ہو۔

اور پھر دوسری کشتیوں اور چھوٹے بڑے جہازوں کے جھرمٹ سے بہت پہلے ہی سمندر میں ان کی کشتی کو روک دیا گیا۔ بحری فوج کی ایک سفید موٹر بوٹ یک لخت کہیں سے نمودار ہوئی۔ اس پر جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ اس نے کشتی کو رک جانے کا سگنل کیا۔ سفید وردی والے افسر نے کشتی میں آ کے ایک ایک کے چہرے کا جائزہ لیا ــــــ پھر دھیمی مگر چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا ــــــ "تم میں مہا دیولن کون ہے؟"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ کوئی جانتا بھی نہیں تھا، مہا دیولن کون ہے۔ تیسری بار افسر کی آواز میں دھمکی اور تلوار کی کٹیلی تیز دھار شامل ہوگئی تھی۔ سہمے ہوئے چہروں سے رنگ غائب ہوگیا۔ لمحے من من بھر کے ہو کر معلق ہو گئے ــــــ ایسے میں گٹار والا نوجوان،

اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے آگے بڑھا۔ اس کی غلافی آنکھیں اب بھی مسکرا رہی تھیں۔

اور جب وہ جھنڈے والی سفید موٹر بوٹ، اس کے ساتھ واپس لوٹ گئی تو ملاح نے کشتی میں خوف زدہ چہروں اور حیران آنکھوں کی طرف دیکھا ______

"ہاں - انہیں معلوم ہو جاتا ہے۔ جب بھی کوئی کشتی ریفوجیوں کو لے کر آتی ہے ______ انہیں سب معلوم رہتا ہے .... اس میں کون آرہا ہے!"

شام ہو گئی مگر ان کی کشتی کو ساحل پر آنے کی اجازت نہیں ملی۔ بے بسی اور امید و بیم کی عجیب ادھیڑ بن میں وہ رات کٹی۔

اور جب صبح ہوئی تو وہی موٹر بوٹ انہیں اطلاع دے گئی کہ اب ان کی حکومت اور پناہ گزینوں کو اپنی زمین پر اتارنا نہیں چاہتی۔ لہٰذا وہ لوگ وہاں نہیں اتریں گے۔

سب سُن سے ہو گئے۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو ______ "مگر ہم تو یہیں کے لئے آئے تھے! ______" کہنا چاہتے تھے، مگر آواز اٹک کر رہ گئی۔

پچھلا پورا دن استوائی سورج کی آنچ کی راست لپٹوں میں گذرا تھا ______ اور ان میں جھلس کر کئی مرد اور عورتیں اپنے سفر کی منزل تک پہنچ چکے تھے ______ مگر ان کی فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب وحشت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہونٹ سوکھ کر تڑخنے لگے تھے، کالے چہروں پر سُرخ چکتیاں پڑ گئی تھیں ______

"تو کیا آج کا دن بھی کشتی میں گذارنا پڑے گا!"

ملاح نے اشارے سے ایک کشتی کو بلایا، اور اس میں وہ کالے کلوٹے ٹھنگنے کے ساتھ ساحل پر چلا گیا۔ وہ لوگ چار پانچ گھنٹے بعد واپس آئے ______ "مجبوری ہے۔ ہمیں اور آگے جانا پڑے گا، ...... ادھر اتر میں" .... کہتے کہتے یک لخت رک کر دیکھا کہ کشتی میں کچھ لوگ اور کم ہو گئے ہیں! اور پھر جلدی سے بتایا ______ "پچنتا مت کرو۔ ہم راشن لے آئے ہیں"۔

مگر فکر راشن کی نہیں تھی۔ جس امید کو لئے گھر سے نکلے تھے، اس کے یوں چکنا چور ہو جانے کی فکر تھی۔

وہ پھر چل رہے تھے۔ چھگ چھگ، اور کشتی سے لہروں کے ٹکرانے کی لپ لپ کے سوا پھر وہی خاموشی چھا گئی ____

مگر جلد ہی یہ خاموشی سمندری طوفان کی پُر ہول آوازوں میں بدل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، سارا سمندر تہہ و بالا ہونے لگا۔ پر شور ہواؤں میں لہروں کے پہاڑ بن کے بہے جا رہے تھے ____ معمولی موٹر بوٹ کی بساط ہی کیا! کسی بھی پل دم توڑ کر مری ہوئی مچھلی کی طرح الٹی ہو جا سکتی تھی۔ موت کے سائے میں سب لوگ دم رد کے بیٹھے رہے۔

اور پھر ایک مہیب لہر، چینی ڈریگن کی طرح منہ کھولے آئی اور دندناتی ہوئی کشتی میں سے گذر گئی۔ اور ساتھ میں ان سب کو لے گئی جو اس کے تھپیڑوں کی زد میں تھے۔

کوئی دو گھنٹے بعد جب طوفان تھما، تو ملاح اور کلوٹا بونا انجن اور اسٹیرنگ چھوڑ کر نیچے فرش پر پڑ گئے ...... بے جان، بے سدھ۔ سانسوں کی دھونکنی زور زور سے چل رہی تھی۔

اب کشتی میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ سندری بھی لہر کے تھپیڑے کی نذر ہو گئی تھی۔ نیچے کچے لوگوں کے ستے ہوئے چہروں سے ڈر لگ رہا تھا۔ پتہ چلانا مشکل تھا کہ زندہ بھی ہیں یا ذرا سے دھکے سے لڑھک جائیں گے!

اور پھر وہی شام کا اندھیرا پھیلا، رات آئی۔ اور تاروں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس چھوٹے سے لنڈورے منڈے قافلے کو دیکھا، جو وطن سے چلا تھا، وطن کی تلاش میں۔

ملاح نے اندھیرے میں کلوٹے سے سرگوشی کی ____ ابھی خطرہ ٹلا نہیں تھا ____ ادھر کے ساگر میں ایسے ہی طوفان آتے رہتے ہیں۔

مگر سمندر میں طوفان پھر نہیں آیا۔ البتہ کشتی کے اندر طوفان اس وقت مچا جب صبح کو انہیں پھر اس بڑی بندرگاہ پہ اترنے نہیں دیا گیا، جہاں وہ پہنچے۔ اور جہاں رہ کر بھی وہ خود کو

تسلی دینے کے لیے تیار تھے کہ اپنے وطن سے دور نہیں ہیں' ـــــ مگر اجازت نہیں ملی۔

الو کے پٹھو' وطن کی چوکھٹ ایک بار الانگ کر' آدمی بے دست دپا ہو جاتا ہے .... اور تم تو گھر کا دروازہ بند کر کے کنڈی بھی لگا آئے" مردود و۔ تم مر چکے ہو۔ اور... مردہ بدست زندہ' کیا اتنی بات نہیں جانتے ؟ سالو؟ ـــــ وہ ادھ موا سا کشتی کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ سب کو اپنی بات زور زور سے سنانا بھی چاہتا تھا' ـــــ اب اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ مگر کہہ نہیں سکا۔ کمزوری نے نڈھال کر دیا تھا۔

انہیں پناہ ملی' تیسری بندرگاہ میں۔ سوریہ دیوتا کے چرنوں میں۔ وہاں سے بھی انہیں اندرونی علاقے میں بھیج دیا گیا۔ جہاں تاریک جنگلوں میں قبائلی رہتے تھے ـــــ اجنبی چہرے' اجنبی زبان' اجنبی رہن سہن ..... سب اجنبی !

عجیب بات تھی۔ سات آٹھ مسافر جو یہاں تک پہنچ پائے تھے' ان میں ایک دو کے سوائے سب بوڑھے تھے ...... یا پھر شائد بوڑھے ہو چلے تھے۔

سندری کا پتا بھی زندہ لاش کی طرح سرکاری افسروں کے ساتھ وین میں سے اترا۔ گاؤں کے ننگ دھڑنگ بچے اس کے گرد جمع ہو کر تعجب اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کے پیچھے کھڑے ہوئے ان کے بڑوں کی آنکھوں میں نہ تعجب تھا' نہ دلچسپی۔ وہاں غصہ تھا! ہر چوڑی چوڑی ناکوں کے نتھنے اور پھیل گئے تھے۔

"ادھر دیکھو .... کیا نام ہے تمہارا ؟ .... وہاں ندی کے اس طرف تمہیں دس ایکڑ زمین ملے گی۔ جنگل صاف کر کے کھیتی باڑی کرنا ـــــ اور ہاں ۔ کل سرکاری مزدور بانس اور ٹٹیاں لا کر' تمہارے لئے ایک .... گھر بنا دیں گے۔ تمہیں یہیں رہنا ہے .... سن رہے ہو ؟"

ـــــ یکایک سندری کا باپ ہنسنے لگا۔ ہنستا چلا گیا ....' دیوانہ وار قہقہے .... ایک کے بعد دوسرا ...... دوسرے کے بعد تیسرا ! ▲▲

آٹھواں سفر

اس رات سندباد بہت مسرور تھا کہ اس کے دسترخوان پر مہمانوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی۔ خاصہ بڑھا دیا گیا۔ بڑی بڑی قابوں اور چینی کے منقش بادیوں میں اندلس اور انقرہ کے باغوں کے انگور اور سیب لائے گئے۔ آبنوسی جسم والے سجیلے حبشی غلاموں کے قدم سرخ ایرانی قالینوں کی دبازت میں دھنسے جا رہے تھے۔

اطلسی غلاف والے گاؤ تکیے پر کہنی کے بل جھکتے ہوئے سندباد جہازی نے ایک نظر مہمانوں پر ڈالی، اور حیرانی کا ہلکا سا سایہ چہرے پر کوند گیا۔ مخمل کی واسکٹ میں سے چاندی کی گول ڈبیا نکالی اور اس میں سے سنہری ورق میں لپٹا ہوا ایک موتی نکال کر منہ میں ڈال لیا۔ رات کے کھانے کے بعد سندباد کی یہ عادت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔

حیرانی کی بات اس رات یہ ہوئی کہ وہاں اسے ہر رنگ اور نسل کا چہرہ نظر آیا ..... چپٹا سیاہ فام، سپاٹ نتھنوں والا چہرہ، خزاں رسیدہ پتے کی طرح مرجھایا ہوا زرد چہرہ، مل گجی مٹیالا چہرہ، جس پر آسیب زدہ ویرانی برس رہی تھی۔ ستواں ناک اور تیکھے نقوش والا چہرہ، جو کبھی خاصا دلکش رہا ہوگا ..... مگر اب اس کا پاکیزہ رنگ مکدر ہو چکا تھا۔

سندباد نے دیکھا کہ سارے چہروں میں آنکھیں اپنی چمک کھو چکی تھیں ..... بے جان مردہ ..... پتھر کی سی مصنوعی لگ رہی تھیں۔ اس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔

دلکش، ستواں ناک والے چہرے نے کہا " اے سندباد! ہمیں دیکھ کر یوں حیران نہ ہو۔ ہم بھی کبھی تیری طرح محلوں میں رہتے تھے۔ ہماری طاعت کے لیے غلام ہوا کرتے تھے۔ ہم دور دراز ملکوں سے آئے ہیں ..... سمندروں کے سینے چیر کر

پہاڑوں کو پھلانگ کر، ہمارے جزیروں سے کبھی تیرے جہاز بھی گزرے ہوں گے۔ آج ہم خانماں برباد، ملک ملک بھٹک رہے ہیں۔ مگر تو ہمیشہ کی طرح شاد و آباد ہے۔ یہ کیا راز ہے! ...... یہی جاننے کے لیے ہم تیرے یہاں آئے ہیں۔"

سند باد کے ہونٹوں پر خاموش مسکراہٹ پھیلتی گئی۔

مل گجے مٹیالے چہرے نے اسے دیر تک دیکھا ——— "ہم بھول گئے تھے مسکراہٹ کیسی ہوتی ہے......"

سند باد کی مسکراہٹ سکڑنے لگی۔ اس کی پیشانی پر تردد کا بادل چھا گیا ———

"کیا دنیا میں رنج والم اس درجہ بڑھ گیا ہے!"

"تو صدیوں سے محل سرا کے محراب و در چھوڑ کر باہر نہیں گیا...... تو کیا جانے اس دنیا پر کیا کیا بیت گئی!"

سند باد سوچ میں ڈوب گیا۔

"یا پیر و مرشد آپ نے بتایا نہیں یہ دائمی راحت کی زندگی آپ نے کیسی پائی؟"

"سفر"

سب نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔

"سفر" ——— سند باد نے دہرایا۔

چہرے چُپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"حیرانی کی کیا بات ہے؟ سفر...... سفر نے ہی مجھے سب کچھ دیا۔ مال و دولت، علم و تجربہ، عقل و دانش۔ میں نے سات سفر کیے تھے۔"

مل گجے، مٹیالے چہرے نے مؤدبانہ کہا "آپ کے سفروں کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ آپ کا دل دکھانا مقصود نہیں۔ مگر ادھر عرصے سے آپ سفر پر نہیں نکلے۔ ورنہ جان جاتے......" بات ادھوری چھوڑ کر وہ رُک گیا۔

سند باد نے آہستہ سے پوچھا "کیا جان جاتا؟"

چپٹی ناک والے سیاہ چہرے نے کہا "اب جزیروں کے لوگ آپکے جہازوں

کو خوش آمدید نہیں کہتے ..... آگ لگا دیتے ہیں' اور آگ سے بھاگتے ہوئے لوگوں کو کانے دیو پکڑ پکڑ کر بھون کر کھا جاتے ہیں"۔

مرجھایا ہوا زرد چہرہ بڑی دیر بعد بولا "محترم آقا...... نیلے سمندروں کا پانی سیاہ پڑ چکا ہے۔ قزاقوں نے راستوں پر پہرے بٹھا دیے ہیں۔ بھٹکے ہوئے جہازوں کو افق پر سبز زمینیں دکھائی نہیں دیتیں ...... کوئی کبوتری بھی زیتون کی شاخ نہیں لاتی ___ اور کہیں کوئی جہاز کسی ویران جزیرے کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تو وہاں رینگتے ہوئے انسانی جسموں کے پنجر ملتے ہیں' جن سے نشے میں بسے ہوئے زہر سے موت کی بو آتی ہے ..... اب کون کس طرف سفر کو نکلے؟"

"کون راہ سجھائے؟ ..... مچھلی کی لاش بھی سیاہ پانی میں الٹی تیر رہی ہے! ___ مل گجے چہرے نے کہا

یکایک سب چپ ہو گئے۔ سندباد کے چہرے پر سخت تردد کے آثار تھے اس نے پوچھنا چاہا ___ "تم نے ایسے کتنے سفر کیے ہیں جو..... ؟" مگر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ستواں ناک والے نے کہا "آقائے محترم، ہم مسلسل سفر میں ہی ہیں ___ جب سے ہوش سنبھالا ہے"۔

سندباد کے محل میں اب مکمل سکوت چھا گیا تھا ___ مطربائوں کے نغمے، دَف اور نفیری کی آوازیں سب سو چکے تھے ___ سندباد نے پہلو بدل کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر پھر چُپ ہو رہا۔

"آج سفر ہمارا مقدر بن چکا ہے .....؛ زرد چہرے نے جھریوں میں سے کہا "کون شوق سے اپنا وطن چھوڑتا ہے۔ مجبوراً جانا پڑتا ہے ..... پرندوں کی طرح آب و دانے کی تلاش میں ___"

چپٹے سیاہ فام نے کہا "یا پھر سنگینوں کی نوک پر۔ خوف زدہ لوگوں کے قافلے بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی طرح ہانک دیے جاتے ہیں ..... سرحد پار، اجنبی زمینوں میں ..... جہاں نفرتیں اُگتی ہیں۔ دیس نکالا بہت بڑی سزا ہے سندباد ___"

سند باد پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ مطمئن نہیں ہوا تھا کہ سفر برکتوں کی بجائے اذیتوں کا وسیلہ بن گیا ہے! ـــــ "میرے لئے سفر ہمیشہ برکت کا باعث رہا"۔

"وہ اس لیے برادر نامور کہ آپ ہر سفر کے بعد اپنے وطن لوٹتے رہے ...... اپنے گھر ..... اپنی چھت کے نیچے! شاخ پر گھونسلا برقرار رہے تو پرندے کا وجود بکھرنے نہیں پاتا"۔ مل گجے مٹیالے چہرے نے کہا۔

سندباد خاموش بیٹھا رہا۔

"اب کوئی ایک دفعہ گھر چھوڑ جائے تو پھر واپس نہیں آتا!" تیکھے نقوش والے اُداس چہرے نے کہا ـــــ "وہ لمحہ بڑا سفاک ہوتا ہے سندباد، جب کوئی گھر کی دہلیز پھلانگ جاتا ہے۔ زمین عورت کی طرح ایک دفعہ چھوٹ جائے تو پھر اجنبی ہو جاتی ہے۔ خدوخال بدل جاتے ہیں، مزاج بدل جاتے ہیں۔ وہ غیر ہو جاتی ہے .... خواب، صرف خواب ساتھ چلتے ہیں .... فاصلوں کی دیواریں پھاندکر ..... اذیت ناک خواب! بے وفائی کی سزا دینے کو"۔

تیکھے نقوش والے کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے رک گئی ـــــ سب چپ چاپ اُسے تکتے رہے ...... آواز پھر ابھرنے لگی ....

"اور اب واپس جانے کی فرصت ملے گی تو ...... دیر ہو چکی ہو گی۔ کوئی پہچانے گا بھی نہیں! ... نہ وہ درودیوار، نہ گلیاں، نہ راستے، نہ شجر، نہ ان پر بیٹھے ہوئے پرندے ......، شاخیں ساکت ہو جائیں گی۔ نغمے رک جائیں گے .... کون اجنبی آگیا ہمارے بیچ! ..... سندباد، وہ خواب والی زمین پھر کبھی نہیں ملتی۔ نہ زمین، نہ محبوب ....."

"آدم جو روزِ ازل سے ہجرت میں ہیں ...... دوبارہ خُلد میں پہنچ بھی جائیں تو کون جانے یہ جنت وہی ہو گی؟ ..... وہ وہاں غیر تو نہیں ہو جائیں گے!"

"ایسا نہیں کہتے ... یہ کفر کی باتیں ہیں۔ توبہ کرو معزز مہمان ... رب العزت معاف کر دیتا ہے"۔ سندباد کی آواز میں احترام کی لرزش تھی۔

اور پھر خاموشی میں سب لوگ سر نیوڑھائے بیٹھے رہے۔

"تو پھر رب العزت نے ہجر مسلسل اور جلا وطنی کی سزا ہمارے مقدر میں کیوں لکھ دی ہے؟ —— نبیوں کو بھی ہجرت کرنی پڑی تھی۔ مگر وہ اسی کا حکم تھا.... سندباد" ہم تو نبی نہیں ہیں نہ خدا نے ہمیں اپنی زمینیں چھوڑنے کو کہا...... پھر بھی ہم آج خانہ بدوش دیس دیس پھر رہے ہیں، پناہ کی تلاش میں! کیا تو ہمارے لیے ایک اور سفر نہیں کرسکتا؟.... آٹھواں سفر؟"

سندباد جو سوچوں میں غرق تھا، چونک پڑا —— "کس لیے؟"

—— "کہ تو کوئی نیا جزیرہ، نئی زمین تلاش کرے۔ جہاں زیتون کے سایوں میں ہماری نسلوں کی جڑیں جمی رہیں؛ پھر کبھی کوئی انھیں اکھاڑ نہ سکے!....... سندباد۔ تو پھر ایک بار اپنا جہاز نکال، اور اجنبی پانیوں کا رُخ کر.... تو دنیا کا سب سے ماہر جہاز راں ہے۔ ہمیں اپنے جہاز میں لے چل ——"

یک بارگی سندباد اٹھ کر کھڑا ہوگیا "واللہ —— اے عزیزو، میں ایسا ہی کروں گا۔ میں تمہارے لیے، تمہارے ساتھ آٹھواں سفر کروں گا۔ میں نے طے کرلیا تھا، اب کوئی سفر نہیں کروں گا۔ مگر اب میں اپنی قسم توڑتا ہوں۔ سفر مقدر ہے تمہارا بھی، میرا بھی ... میں سیاہ پانیوں میں جہاز ڈال دوں گا۔ کون جانے کسی جزیرے پہ ہمیں راستہ بتانے کے لیے کوئی منتظر کھڑا ہو!"

▲▲

ریزہ ریزہ مہک

تو لڑکیو، خدا تمہارا بھلا کرے، یہاں سے دور، بہت دور، سورج سے پورب میں، چاند سے پچھم میں، ستاروں کے بیچ، جو پرستان ہے وہاں کی ملکہ نے شہزادہ نیک بخت کو طلسمی آرسی دی کہ جا میرے بیٹے، تو اس میں جس کسی لڑکی کی صورت دیکھے گا، اس کی سیرت بھی دکھائی دے گی، بہت دیکھ بھال سے کام لینا ——— عورت ذات کو تو نہیں جانتا ———

شہزادے نے وہ آرسی لی اور اڑن کھٹولے پر اڑتا گیا، دیس دیس .... صحرا صحرا۔

ایک گل بدن، مجسم جمال، رشک حور، فیروزہ پری پرستان سے نہا کر نکلی تھی اور بادل پر بیٹھی گیلے بال سکھا رہی تھی۔ بادل بھی نیساں کا، جو کبھی بجلی بن جائے، کبھی موتی برسائے؟ جو ہوا بھی تھا، روشنی بھی۔ اور فیروزہ پری کی آنکھوں میں نرگس اور گالوں میں گلاب ڈول رہے تھے۔ لاہی پھلکاری کے پیرہن اور آب رواں کی اوڑھنی میں آذری مرقع لگ رہی تھی۔ ناگہاں چشم مضطر شہزادے پر جا پڑی، جو گوہر مقصود کی تلاش میں تھک کر نخلستان میں ایک کھجور کی ٹھنڈک میں سو رہا تھا۔ دیکھتے ہی ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی۔ سامری اسم پڑھ کر دم کیا، اور اسی عالم میں شہزادے کو پرستان لے گئی۔ سب کی نظروں سے بچا کر، ساجت پردوں کی اوٹ میں، اپنے سیماب محل میں چھپا کر رکھا۔

بیدار ہوا تو شہزادہ نیک بخت اپنے صیاد کے حسن بے مثل کو دیکھ کر خود ہی اسیر ہو گیا۔ ہوش و حواس کے ساتھ آرسی بھی کھو بیٹھا۔ مگر ایک آدم زاد، دوسری پری زاد، ملن ہو تو کیسے! ——— عشق کے بھید نرالے۔

فیروزہ پری نے شہزادے کو صدیوں، قرنوں قید میں رکھا۔ رات دن اس کے

جلوہ حُسن پر فدا ہوتی، آہیں بھرتی، اور اپنے پری زاد ہونے پر کفِ افسوس ملتی ______

مگر ایک دن پری کا دل پسیج گیا۔ شہزادے کو سیماب محل سے رہا کر کے مکمل آزادی دے دی۔ کہ جا میرے دل وجان کے مالک، اپنی مرضی ومراد کی حسینہ دل نواز کو تلاش کر لے۔ کہ آدم زاد کے لئے حوا کی نسل ہی چاہیئے۔

لڑکیاں بت بنی سن رہی تھیں، ______ ' مگر اس کی آرسی؟' ایک نے پوچھا۔ اور دادی ماں نے غصے سے اسے دیکھا۔

' اے لڑکی۔ بیچ میں نہیں بولا کرتے۔ پری نے آرسی چھپا کر رکھی تھی ___ لا کر شہزادے کو دے دی۔ اور ساتھ ہی بھوک پیاس کے لڈو بھی۔ کہ اجنبی وقت میں، اجنبی لوگوں میں کوئی مشکل نہ ہو۔

' تو پری کی قید میں شہزادے نے کتنے دن گذارے؟' ایک اور لڑکی پوچھ بیٹھی۔

بڑی بی نے سفید بگلا سر کھجایا، اور سوچ کر بولیں ___ 'جب شہزادہ چلا تھا تو سلیمان پیغمبر کو ہُد ہُد نے اطلاع دی تھی۔ اور جب پری نے آدم زاد کو آزاد کیا تو اولادِ آدم کے قدم چاند پر جا پہنچے تھے ___ اتنا عرصہ گذارا شہزادے نے فیروزہ پری کے محل میں'۔

' تو شہزادہ پھر بھی جوان رہا؟' بھولی بھالی، معصوم صورت والی ایک کچی کلی نے پوچھا۔

' اےئے ہئے ___ دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ پٹر پٹر پوچھے جا رہی ہیں! کہا نا کہ بیچ میں ٹوکا مت کرو ___ ایسی بھی کیا بے عقلی کہ یہ بھی پتہ نہیں، پرستان میں عمر کا پہیہ رکا رہتا ہے ___ جو جیسا ہے ویسا ہی رہتا ہے؟' ______ ساری بالیوں نے جھینپ کر نظریں نیچی کر لیں۔

تو خدا کی کرنی یہ ہوئی کہ شہزادہ زمین پر اترا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر چیز اجنبی تھی۔ ملک نئے، جنگل اور پہاڑ نئے۔ صحرا اور سمندر نئے۔ نئے نئے جزیرے نمودار ہو گئے تھے۔ شہزادہ نیک بخت، جہاں گرد بنا دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتا پھرا...

محوِ حیرت تھا کہ لوگوں کا اتنا ہجوم کہاں سے آ گیا، کہ سطحِ ارض پر پاؤں دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی! ادھر سر بہ فلک عمارتیں نظروں کی دیوار بنی یوں کھڑی ہیں کہ گھٹن سے ہواؤں نے چپ سادھ لی ہے۔

چہروں کو دیکھتا تو سوچ میں پڑ جاتا، ان ترشے ہوئے گیسوؤں اور چست لباسوں میں کسے روح کے، اور کس کی سیرت دیکھے آرسی میں! ـــــ یہاں تو ہر چہرے پر بدحواسی اور بے زاری کھنڈی ہوئی ہے! جیسے خوف میں بھاگا جا رہا ہو۔

یہ لوگوں کے ریوڑ کہاں سے آئے ہیں؟ .... کہاں جا رہے ہیں؟ .... سیاہ، سفید اور زرد، ہر رنگ کے ڈھانچے رینگ رہے تھے .... ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک سرحد سے دوسری سرحد۔ کس سے بات کرے کوئی!

جرأت کر کے ایک ناری کے پاس پہنچا۔ صورت اس کی موہنی تھی۔ آرسی میں سیرت دیکھی تو دنگ رہ گیا ـــــ سیرت کا پتہ ہی نہیں تھا۔ اچھی نہ بری!

'کیا تم سارے جذبات، سارے ارمان ـــــ اپنی فطرت کو کھو بیٹھی ہو؟' ـــــ اس نے پوچھا۔ ابلا خالی خالی نظروں سے اسے تکنے لگی۔ جیسے دیکھ بھی رہی ہو، اور نہیں بھی۔

'کیا میری بات تم سمجھ نہیں پا رہی؟ ـــــ کہاں سے آئی ہو تم؟'

'بہت دور، ادھر پورب کے دیس سے' اس کی ساتھی ایک اور سندری نے کہا ـــــ 'نام بھی یاد نہیں رہا اب تو۔ ہم کب نکلے تھے۔ کیوں نکلے تھے .... نہیں۔ نکالے گئے تھے۔ سنگینوں کی نوک پر۔ ہمیں کچھ یاد نہیں ہے .... ہماری بھاشا... ہمارے لباس ...... ہمارے نام تک یاد نہیں ہیں ـــــ' اس نے اپنا سر باہوں میں تھام لیا۔ اس کے لتے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ پت جھڑ بہت جلدی آ گیا تھا ـــــ باہوں کی مٹیالی زردی میں جگہ جگہ ننھے ننھے سوراخ جھانک رہے تھے، سوئیوں کے سے۔

اور پھر وہ باہیں نیک بخت کی طرف بڑھیں ـــــ 'تم کہاں سے آئے ہو؟..... چلو گے ہمارے ساتھ؟' اور نظریں شہزادے میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔

'تو کیا وہ اکیلی تھیں؟...... ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا؟' معصوم کلی نے پوچھا۔

'وطن چھوٹنے کے بعد سب اکیلے رہ جاتے ہیں۔ جانے والے بھی، اور پیچھے رہ جانے والے بھی ـــــ' بڑی بی کا سفید بگلا سر یوں ہلا جیسے ہوا میں کپاس کا ڈوڈا۔ معصوم کلی سہم کر چپ ہو گئی۔

شہزادہ نیک بخت بوکھلا گیا۔ پیچھا چھڑا کر ایک بڑے اونچے، انسانوں کے ڈربے میں گھس گیا۔ بجلی کے جھولے میں چڑھ کر جانے کون سی اونچائی کے کابک میں جا پہنچا۔ بڑے قیمتی فرنیچر سے سجا سجایا کابک تھا۔ ایک اکیلا بوڑھا، چھوٹے سے پردے پر، چلتی پھرتی بات کرتی ہوئی رنگین تصویریں دیکھ رہا تھا۔

ہر طرف موت کی باس پھیلی تھی۔

شہزادے کو دیکھ کر بوڑھا چیخا ـــــ کون ہو تم؟ کیوں آئے ہو؟ ـــــ خط لائے ہو؟

خط ـــــ! اور اس کے ساتھ ہی جانے کہاں سے ایک بڑھیا کابک میں بڑی خاموشی سے نمودار ہو گئی، جیسے روئی کا گالا ہوا میں اڑتا ہوا آجائے ـــــ روبی کو دیکھنے آئے ہو؟

روبی! ـــــ اور شہزادہ بھاگ نکلا۔ وہ پاگل ہو جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بھاگ کر جائے گا کہاں! ـــــ اس کی بادشاہت کو ختم ہوئے تو سینکڑوں ہزاروں برس بیت چکے تھے، پہلی والی لڑکی نے دادی ماں سے پوچھا۔

کہیں بھی نہیں ـــــ بڑی بی بولیں۔ وہ جاتا کہاں؟ ـــــ

اب وہ گاؤں گاؤں، جنگل جنگل پھرتا گیا۔ صندل، ساگوان، مہوہ اور لوبان کی الھڑ خوشبوؤں نے اسے پھر سے زندگی میں جھلایا۔ مدن مست کی کنواری سگندھ نے ارمان جگائے۔ سر بلند پہاڑیوں نے حوصلے بلند کئے۔ سرسبز وادیوں میں ہرنیوں کی جھنکار نے اسے خوش آمدید کہا۔ کہیں کوہ سار کے ایک بادل نے سرگوشی کی ـــــ کہیں نیستاں میں کسی گیت کے سروں نے اس کے قدم لئے، جو پہاڑی سے اترنے والے چشمے کے کنارے کوئی اہیر بنسی میں بجا رہا ہوتا ـــــ

آبشاروں کی پھوار میں گوریاں بھی ملیں، جو کالے کالے، لانبے لانبے کیس شانوں پر کھولے ہنستی گاتی، اشنان کر رہی تھیں۔ لگتا چاندنی راتیں نہاتی ہوں۔

چشم آہو، نگاہیں ہری دوب، پلکیں پیاؤ کی ٹھنڈک۔

شہزادہ سوچ میں پڑ جاتا ـــــ آرسی میں دیکھتا تو صورت کے سوا کچھ نظر

نہ آتا ـــــ سیرت کا پتہ ہی نہیں تھا ! ـــــ نہ اچھا، نہ برا !

ایسا کیوں ہے ؟ ـــــ وہ روہانسا ہوکر، سوچ میں ڈوبا آگے بڑھ جاتا ـــــ اور آن کی آن میں لگتا، لو وہ سورج چھپا، وہ دن ڈوبا .... وہ اک قدم میں رات آگئی ! اور لڑکیاں جو سر نیوڑھائے بیٹھی تھیں، اداسی کی رات میں اترنے لگیں۔

ـــــ اور پھر ایک دن شہزادہ پھوٹ بہا۔ آنسوؤں کا سیل رکتا ہی نہ تھا۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ تب فیروزہ پری نے آن کر کہا ـــــ

میرے دلبر، میری جان، یہہ سیرت کس کے ہاتھ آئی ہے ! ...... یہہ تو تریا چرتر ہے، ـــــ کبھی آن ہے، کبھی موم۔ آدم کو اذن سفر سیرت کی وجہہ سے ہی ملا تھا۔ وہ روز ازل سے سفر میں ہے۔ زاد سفر میں اب صرف صورت لئے پھرتا ہے، ...... ملک ملک، سرحد سرحد۔ سیرت اتار پھینکی ہے۔ تو بھی آرسی پھینک دے۔ ▲▲

(وزیر حسن کی چاند بی بی سلطان پڑھکر)
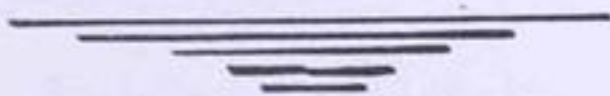
خوابوں کے پُل

گہرے کہر میں طوفانی سمندر کی لہریں چٹانوں پر پاش پاش ہوکر پھوار کی دبیز چادر پھیلا دیتیں اور مٹیالے بادلوں کا سرمہ اس چادر میں دھواں دھواں ہو جاتا۔

ریلنگ پر بیٹھے ہوئے آدمی کے ہیولے کو کبھی یہ دھواں نگل لیتا اور کبھی اگل دیتا۔

اسے کبھی اس آدمی کا چہرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ریلنگ پر ہمیشہ ایسے بیٹھتا کہ نیچے چٹانوں پر سر پٹکنے والی لہروں کا شور سنتا رہے اور ان سے بکھرنے والے موتیوں کو تکتا رہے۔ سڑک کی طرف اس کی پیٹھ ہوتی۔ دونوں پیر دریائی ڈنڈے پر ہوتے۔ دور سے اس کے کوٹ کا رنگ کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ مل گجا سا بھورے رنگ کا لگتا تھا۔ ننگے سر، مگر کوٹ کا کالر اندر کی طرف موڑے رکھتا۔

شمال مغربی انگلستان کی برفیلی ہواؤں میں وہ اس دور افتادہ طوفانی ساحل کے کنارے گھنٹوں بیٹھا کیا کرتا رہتا تھا ——— کچھ ہی دور بینچ پر بیٹھا ہوا آدمی اسے دیکھ کر سوچتا رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی دن وہاں کوئی نہ آتا۔

ویسے اس ویران، آسیب زدہ سے مقام پر آتا ہی کون تھا ——— مغربی اسکاٹ لینڈ کے پتھریلے ساحل کی طرف جانے والی یہ سڑک یہاں ایک موڑ پر سمندر کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ ایک پہاڑی پر نہ جانے کس زمانے کا بنا ہوا ایک قلعہ تھا اور اس کی ڈھلان پر ساحل تک چند گھر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

شام کا اندھیرا بڑھ جاتا تو کہیں سے ایک عورت کا سایہ سا نمودار ہوتا، دھند میں لپٹا ہوا سا، اور جا کر ریلنگ کے قریب کھڑا ہو جاتا ——— اور پھر وہ دونوں چلتے ہوئے

کہر آلود اندھیرے میں غائب ہو جاتے۔ بینچ والے آدمی نے انہیں باتیں کرتے ہوئے کبھی نہیں سُنا۔

مگر اس دن شام کا اندھیرا بڑھتا گیا اور عورت کا سایہ نمودار نہیں ہوا، اور جب سرد مرطوب اندھیرا منجمد ہو کر رات میں جذب ہونے لگا تو بینچ والا آدمی اٹھ کر ریلنگ کے پاس چلا گیا۔

ریلنگ پر سے اُٹھ کر وہ چپ چاپ اس کے ساتھ یوں چلنے لگا جیسے سدھا ہوا بچہ ——

"تمہاری بیوی نہیں آئیں آج؟"

تب اسے پتہ چلا کہ وہ بیوی کے ساتھ نہیں جا رہا ہے۔ "بخار بڑھ گیا ہوگا۔"

اور پہلی بار، بینچ والے آدمی نے اس کا چہرہ دیکھا۔ گندمی رنگ کے ہندوستانی چہرے پر مرطوب ہوا کے تین چار قطرے لرز رہے تھے۔

"تمہارا گھر کون سا ہے؟"

"گھر —— ؟ آواز کی لہریں سانسوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔ وہ نیچے دیکھ کر چل رہا تھا —— "بہت دور ہے" جمنا کے کنارے ——"

بینچ والے آدمی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کا گھر آ گیا تھا۔ وہ اسے اندر لے گیا۔ وہ اسی فرماں برداری کے ساتھ چلا آیا۔ جیسے اس کے لیے اس گھر میں اور اپنے گھر میں کوئی فرق نہ ہو۔

یہ ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا۔ آتش دان کے سامنے دونوں بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں پر شعلوں کے عکس لرزاں تھے۔

اور تب بینچ والے آدمی نے دیکھا کہ اس کے مقابل کا چہرہ کتنا اداس ہے —— ویران کھنڈر —— ویسا ہی خاموش۔

اسی خاموشی میں اس نے ایک ہی گھونٹ میں وہسکی کا سارا پیگ خالی کر دیا۔ کوٹ کی آستین سے ہونٹ پونچھتے ہوئے وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید اسے خاموشی ہی پسند تھی۔

کاٹیج والے آدمی نے دوسرا پیگ دیا۔ اس نے اسے بھی اسی تیزی سے خالی کر دیا۔ آتش دان میں کوئی لکڑی کا ٹکڑا زور سے چٹخا اور چنگاریاں اڑتی ہوئی دور تک چلی آئیں —— وہ انہیں بچے کی طرح دیر تک دلچسپی سے دیکھتا رہا —— اس وقت اس کا چہرہ کتنا معصوم لگ رہا تھا۔

"میں تمہارے گھر اطلاع کروا دوں ـــــ کہ تم ـــــ ؟" اور وہ رک گیا۔

"مجھے کیا ہوا ہے ؟" معصوم چہرے نے پوچھا۔

"تمہاری بیوی بیمار ہے"

"ہاں ـــــ لوسی بیمار ہے" رکتے رکتے ایسے کہا جیسے بھول گیا تھا۔

ذرا سے پس و پیش کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے خود سے باتیں کیے جا رہا تھا ـــــ مجھے جانا ہے۔ لوسی بیمار ہے ـــــ مگر وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے کچھ نہیں ہو گا ـــــ وہ مرے گی نہیں۔ کہیں اپنے گھر میں بھی کوئی مرتا ہے ؟

یکایک وہ پلٹ کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"اپنا گھر ماں کی گود ہوتا ہے ـــــ جہاں زندگی ملتی ہے۔ اسے چھوڑ کر میں کب سے اپنی لاش اٹھائے پھر رہا ہوں۔ مگر تمہیں یہ سب کیا معلوم ـــــ تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم ـــــ"

عجیب بے بسی اور پس و پیش کے عالم میں وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا ـــــ "کیسی عجیب بات ہے ـــــ برسوں کے بعد آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ باتیں کروں ـــــ اپنی باتیں ـــــ" اور ہولے ہولے واپس آ کر آتش دان والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ مت سمجھنا اس کی وجہ تم ہو۔ اس کی وجہ یہ آتش دان ہے' اس میں چٹختی ہوئی چنگاریاں ہیں۔ انہوں نے مجھے اس گود میں پہنچا دیا جہاں میرا جنم ہوا تھا ـــــ اونچے اونچے دالان، محرابیں ـــــ آتش دان والا پکا کوٹھا ـــــ چوبارے سے جمنا صاف دکھائی دیتی تھی"۔

اور پھر وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا آتش دان کو دیکھتا رہا۔ بینچ والے آدمی نے بھی کوئی بات نہیں کی۔

"کتنا بھرا پُرا تھا وہ گھر ـــــ بڑا ہونے پہ بھی چھوٹا لگتا تھا۔ صحن میں آم اور جامن کے درختوں کے نیچے۔ بچوں کا ہلڑ مچا رہتا، اور شام کو ان کی شاخوں پر چڑیاں جمع ہو کر

شور مچاتیں ـــــــ اور پھر ایک دن وہ سب وہیں چھوڑ کر میں چلا آیا، بتیس برس ہو گئے۔ اس چوکھٹ کو پھر کبھی دوبارا نہیں پھلانگ سکا۔"

بینچ والے آدمی نے کچھ پوچھنا چاہا، مگر ہاتھ کے اشارے سے کوٹ والے نے چپ کر دیا۔

"تم انگلستان میں رہ کر کیا جانو، ان دنوں ہمارے دیس میں کیا اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ ایک تاریخ مٹ رہی تھی۔ ایک بن رہی تھی ـــــــ ہر طرف افراتفری تھی، مستقبل غیر یقینی لگ رہا تھا۔ لوگ اپنے گھر چھوڑ چھوڑ کر ہر سمت بکھرے جا رہے تھے۔ میں بھی بکھر گیا، ایسا کہ ـــــــ پھر آج تک نہ جڑ سکا! ـــــــ یہ جو تم دیکھ رہے ہو، میرا دوسرا قالب ہے۔ اس میں اور میرے پچھلے وجود کے ٹکڑوں کے درمیان ـــــــ بس ایک واسطہ رہ گیا ـــــــ خوابوں کا ـــــــ خوابوں کے پل پر سے گزر کر یہ ٹکڑے رات کی تاریکی میں ایک ایک کر کے آ جمع ہوتے ہیں اور میرا وجود مکمل اٹھتا ہے، جیسے فاختہ زمین کی خوشخبری لے آئی ہو ـــــــ

مگر پھر صبح کو اس وجود کا انگ انگ بکھر جاتا ہے ـــــــ صرف دوسرا قالب رہ جاتا ہے، اور اس کے رگ و پے میں خواب کے چھوڑے ہوئے کرب کا نشتر! ـــــــ ہر خواب ایک نائٹ میئر کی طرح جھنجھوڑ جاتا ہے۔ خوابوں کا یہ سلسلہ میرا مقدر بن چکا ہے ـــــــ اور میں ریلنگ پر سہما بیٹھا رہتا ہوں ـــــــ اگلے نائٹ میئر کے خوف میں ـــــــ

مسلسل بولنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ جانے کتنے دن کا لاوا پھٹ پڑا تھا ـــــــ دوسرا آدمی سوچ رہا تھا کیا اس کی بیوی یہ سب جانتی ہے!

"اب جان گئی ہے ـــــــ وہ میرا دکھ سمجھنے لگی ہے" جیسے دوسرے آدمی کے خیالات اس نے پڑھ لیے ہوں ـــــــ "سفید قوموں کے لیے بے وطنی ایک غیر اور اجنبی مسئلہ ہے۔ کیا تم ـــــــ میری ٹریجڈی جان سکتے ہو؟"

میزبان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس جواب تھا بھی نہیں ـــــــ اور پھر بہت دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے ـــــــ آتش دان میں شعلے اب دب چکے تھے۔ ہلکی ہلکی تمازت ہر طرف پھیل گئی تھی۔ جس میں دبک کر خاموشی اور بھی تمتما اٹھی ـــــــ

"بتیس ۳۲ برس بہت ہوتے ہیں ــــــ اتنے دن تم کہاں رہے؟"

"لندن میں ــــــ لوسی کے ساتھ ــــــ ریٹائر ہونے تک" ــــــ کوٹ والے آدمی کی آواز میں اب تناؤ نہیں تھا ــــــ خاور امریکہ میں سیٹل ہوگیا ــــــ لیزا آسٹریلیا میں ریسرچ کر رہی ہے۔ شاید شادیاں بھی کر لی ہیں" ــــــ اس نے خود ہی پہل کر کے میزبان کے پس و پیش کو ختم کر دیا ــــــ اور پھر چند لمحوں کے لیے چپ ہوگیا۔

"بتاؤ۔ کون سے دیس جاؤں ــــــ تم پوچھنا چاہتے تھے ان بتیس ۳۲ برسوں میں کبھی اپنے دیس کیوں نہیں گیا؟ کس لیے جاتا؟ ان دروں اور محرابوں میں اب کون رہا ہوگا ــــــ چھوٹے بڑے سب چلے گئے ــــــ بکھر گئے۔ کھو گئے ــــــ ہجوموں میں، قافلوں میں ــــــ" اس کی آواز بھرّا ہوا ہونے لگی۔ تناؤ بڑھ رہا تھا۔

"آم اور جامن کی شاخوں پر شور مچانے والی ساری چڑیاں اڑ گئیں ــــــ موسم بدلتا ہے تو پرندے ہجرت کو جاتے ہیں مل کر اڑتے ہیں تو واپس بھی آتے ہیں۔ مگر ایک ایک کر کے اڑیں، الگ الگ سمتوں میں، تو کوئی واپس نہیں آتا ــــــ کوئی واپس نہیں آیا ــــــ سنا تھا، وہ حویلی بھی باقی نہیں رہی ــــــ اس دن اس کی چوکھٹ الانگ کر میں نے بھیانک غلطی کی ــــــ بے وفائی کی۔"

اس کی آواز کپکپانے لگی تھی۔ پینچ والے آدمی نے اس کے گلاس میں تھوڑی سی وہسکی اور ڈال دی۔

"ہمارا سارا خاندان بے نام و نشان ہوگیا۔ پشتوں سے چلا آرہا تھا ــــــ وہ رہن سہن ــــــ ہمارے طور طریق ہمارے کارنامے، ہمارے راز ــــــ ہمارے گھریلو نام، "آناً فاناً" نیست و نابود ہوگئے۔ تیس برس کوئی بڑا وقفہ نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے لیے قیامت ڈھا گیا ــــــ" اس کی آنکھوں میں صدیوں کی ویرانی تھی، اور آواز میں درد کا دریا۔

ہماری نسل کے بعد کون جانے گا، کون کہاں کا رہا ہے ــــــ اس کے آبا و اجداد کون تھے؟ ــــــ دادا کے نام بھی یاد نہیں رہیں گے ــــــ کہاں کا کلچر ــــــ کون سا مذہب ــــــ زبانیں، نام اور لباس بھی بدل جائیں گے ــــــ

بتاؤ، کون میرے خواب سُنے گا ــــــ کون میرے گھاؤ دیکھے گا ــــــ کیسے دل چسپی ہوگی ؟
ــــــ میں کتاب کے آخری صفحے کا آخری جملہ ہوں"

اس کی آنکھیں بند تھیں ۔ ہلکی ہلکی تمازت میں اس کا گندمی چہرہ آتش دان کی طرح دہک رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح بیٹھا رہا۔

یکایک دوسرے آدمی کے ذہن میں ایک خیال آیا ــــــ "کیوں نہ تم ایک بار ان خوابوں کی سرزمین میں ہو آؤ ؟ تاکہ پھر وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دیں ــــــ تم ان کی گرفت سے آزاد ہو جاؤ ــــــ"

اور پھر ایک لمبا وقفہ گزر گیا ۔ نیچے والے آدمی کو ریلنگ پر وہ آدمی نظر نہیں آیا ۔ وہ بے چین رہنے لگا ۔ کیا اس نے خوابوں کے پل پر سے واپس جانے کی ہمت کر لی ۔

اور پھر ایک شام اس نے دیکھا کہ ریلنگ کے سہارے اس کی بیوی کا دھندلا سایہ کھڑا ہے ، اسی جگہ ــــــ جہاں سے اس کا شوہر نیچے گہرائیوں میں سمندر کی لہروں کو چٹانوں پر سر ٹپکتے دیکھتا رہتا تھا ۔

"نہیں ، وہ واپس نہیں آیا ، اس کی بیوی نے بغیر پلٹے کہا ــــــ نہ ماں کی گود ملی ، اور نہ شاید خوابوں سے آزادی ــــــ"

نیچے والا آدمی ریلنگ پر جھک کر کھڑا ہو گیا ــــــ "مجھے پوری بات سُنا سکو گی ؟"

"ہے ہی کیا سُنانے کو ــــــ سارا ولولہ ، سارا تناؤ ــــــ جاتے ہی ختم ہو گیا ۔ مجھے یاد ہے جب جمنا کے کنارے وہاں پہنچے تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے ۔ اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں تھوڑی سی مٹی اٹھائی ــــــ جیسے وہ بہت مقدس ہو ــــــ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھوں کو جھٹک دیا ــــــ مٹی کی بجائے نکیلے کنکروں نے انہیں ڈس لیا تھا ــــــ اجنبی کنکروں نے ــــــ یا پھر شاید وہ خود ان کے لیے اجنبی تھا ــــــ" چند لمحوں کے لیے وہ رک گئی ۔ پتہ نہیں کون سے دھندلکوں میں کھو گئی تھی ۔

"ہاں ہر چیز اجنبی تھی ۔ ہر گھر ، ہر گلی ــــــ نئے چہروں کے ہجوموں سے وہ گھبرا اٹھا ــــــ یہ اس کے خوابوں کی سرزمین نہیں تھی ــــــ اجنبی ــــــ اجنبی ــــــ

اسے ہر سمت سے آوازیں آ رہی تھیں ـــــ یہ کون آ گیا ـــــ اجنبی ـــــ اجنبی ـــــ
ـــــ اور وہ جمنا کی ریت پر تنہا کھڑا تھا ـــــ مجرم کی طرح ـــــ تب پہلو سے اس نے ایک آواز سنی، بھاری گنجیلی آواز ـــــ

مورکھ۔ جگہ کو صرف تین دشاؤں میں جکڑ کر نہیں رکھا جا سکتا ـــــ ایک چوتھی دشا بھی ہوتی ہے ـــــ سمے کی۔ اس ایکسس پر بہتے ہوئے دھرتی بھی تنکے کی طرح بے بس ہو جاتی ہے۔ انگ انگ اُدھڑ جاتا ہے۔ سمے کی تیز آندھی اس کے سینے پر سے ہر نشان مٹا دیتی ہے۔ ـــــ نئے نشانوں کے لیے۔ چوتھی دشا بڑی ظالم ہے ـــــ تو کون سے نشان ڈھونڈھ رہا ہے؟

جمنا کی ریت پر بیٹھے ہوئے سادھو کی آواز میں ایسی اپنائیت تھی کہ میرا شوہر اس کی طرف کھنچا چلا گیا۔ اس کی باتوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔"

اور وہ چپ چاپ سامنے سمندر میں بہت دور دیکھنے لگی ـــــ جہاں دونوں نیلاہٹیں مل جاتی ہیں۔ بڑی دیر بعد بولی۔

وہ دونوں کہیں شمال کی طرف چلے گئے۔ پتہ نہیں انسے خوابوں سے نجات ملی یا نہیں۔"

شام کا دھندلکا پھیل گیا تھا، اور پہاڑی کی ڈھلان پر اکّا دکّا روشنیاں جھلملانے لگی تھیں ـــــ ہر روز کی طرح ـــــ
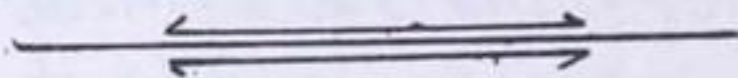
دِل زار

آج پھر نندن آیا تھا۔ کہنے لگا جا کر اپنا نام اور پتہ، پچھلا اور موجودہ، لکھا آؤ۔ ورنہ وہ لوگ یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ اس پردیسی شہر میں جزیرے کے لوگ روز آرہے ہیں۔

اور وہ یہہ شہر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اِس لئے کہ یہیں سے ایک دن اسے واپس جانا ہے ...... جزیرے کو۔ جہاں اس کا گاؤں ہے، اس کا وطن۔ شری رام بھی اس جزیرے پر چڑھائی سے پہلے اِس شہر میں ٹھہرے ہوں گے۔ کون جانے!

مگر واپس جانا ہے تو نام کیسے لکھوا سکتا ہے! ـــــــ ـــــــ پھر جائے گا کیسے؟

وہ یہہ شہر چھوڑ کیسے سکتا ہے؟ ...... وہ یہیں تو رہتی ہے۔ اس کے ساتھ نہہ سہی، مگر اسی لمبے، چوڑے اور اُونچے اُٹھتے ہوئے شہر کی فضاؤں میں وہ بھی سانس لیتی ہے۔

اسے اس کا پتہ نہیں معلوم ـــــــ کبھی بتایا بھی نہیں اس نے، اور نہہ شائد اس نے پوچھا کبھی! مگر ہر تھوڑے دن میں وہ اسے مِل جاتی ہے ..... کسی دکان سے نکلتی ہوئی ...... کسی موڑ پر ٹیکسی کو بلاتی ہوئی۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جزیرے سے وہ بھی اسی شہر بھاگ آئی تھی۔

اس شام وہ اکیلا کھڑا سمندر کی موجوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا، کب چُپ چاپ اس نے اپنی موٹر لا کر کھڑی کر دی، اور ہاتھ بڑھا کر اگلا دروازہ کھول دیا۔ وہ بیٹھ کر سنبھلا بھی نہیں تھا، کہ اس نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔

"تمہاری نئی نظم بڑی پیاری ہے"

"تم نے کب پڑھی؟"

"بھول گئے؟ ـــــــ تم ہی نے تو سُنائی تھی۔"

"تو تمہیں یاد ہے؟!"

"ہوا کے شریر جھونکے نے تمہارے بال بکھیر دئے ــــــ

مگر تم باگیسری گاتی رہیں، آنکھیں بند کئے۔ اور یہہ بھی نہیں دیکھا،

سفید بگلوں کی قطار، کالے بادلوں سے نکل کر نیچے دھرتی پر چلی آئی ــــــ

اور تم باگیسری گاتی رہیں، آنکھیں بند کئے۔ بال پھیلائے

اور یہہ بھی نہیں دیکھا، وہ تمہاری ہر تان کی موجوں کے ساتھ اڑان بھرتے رہے،

ــــــ اوپر، نیچے، آگے، پیچھے ــــــ"

سمندر کی ہوائیں اس کے بال بکھر بکھر جا رہے تھے، اور وہ نظم سنا رہی تھی۔ آواز کی مٹھاس میں راگنی کا نشہ تھا۔

"تمہیں تو ایسے یاد ہے، جیسے تم نے ہی لکھی ہو!"

اور وہ ہنس پڑی۔ فضاء میں پھول بکھر گئے ــــــ بنفشی، قرمزی، کاسنی اور گلابی۔ "مگر نظمیں لکھنے سے پہلے تم جرنلزم پاس کرلو۔ ضروری ہے ــــــ سمجھے؟"

ایک وہی تھی جو کھٹ سے اسے گھسیٹ کر زندگی کی حقیقتوں کی چوکھٹ پہ لا کھڑا کرتی ــــــ کبھی غصے سے، کبھی ناز سے، ــــــ کبھی محض کھِل کھلا کر ہنستے ہوئے اور کھِل کھلا کر ہنستی بھی تو لگتا جیسے لمحہ بھر کے لئے ننھے ننھے نقرئی گھنگھرو تھرک کر رک گئے ہوں۔

اور اس دن بھی اس کی ہنسی کے سُروں کی مٹھاس ابھی ہواؤں میں باقی تھی کہ ــــــ اس نے موٹر روک کر دروازہ کھول دیا۔

وہ ساحل پہ اسی جگہ کھڑا تھا ــــــ اور اس کی موٹر جا چکی تھی۔

عجیب بات ہے۔ جزیرے میں جب بھی وہ ملتے تو وہ بلا جھجک اس کے ساتھ ہر جگہ پھرتی ــــــ کالج میں، سڑکوں پر، سینما میں ــــــ مگر یہاں، اس شہر میں وہ بس ذرا دیر کے لئے ہی آتی ہے۔ دل کے ایک دروازے سے داخل ہوتی ہے، اور جھونکے کی طرح دوسرے دروازے سے نکل جاتی ہے۔ اور وہ جب چونکتا، وہ جا چکی ہوتی ہے،........

اسے اداس چھوڑ کر!

یہہ اداسی لئے وہ کب سے پھر رہا ہے!

دہاں ان کے وطن میں سب کو پتہ تھا وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں، جنم جنم کے ساتھی ...... کالج سے نکلتے ہی بڑے بوڑھے ان کے بندھنوں کی رسم بھی پوری کر دیں گے۔

اور جب شہر میں قتل و خون پھوٹ پڑا ـــــ دھماکے ہونے لگے، ہوا میں مشین گنوں کی ـــــ آواز اور بارود کی بو بس گئی، کرفیو لگ گیا اور ہاسٹلوں پر حملے ہونے لگے، تو شہر سے بھاگ کر وہ دونوں جنگل کے راستے جان بچا کر گاؤں واپس آ گئے۔ راستے میں کبھی وردی والوں سے چھپنا پڑا، اور کبھی چھاپہ ماروں سے، ـــــ کیونکہ کہیں بھی یہ پتہ نہ چل سکا، کون کس کے لیے لڑ رہا ہے! ـــــ ان کا محافظ کون ہے؟ لنکا میں سبھی باون گز کے تھے۔

انہیں گھنے جنگل کے پیڑوں تلے اندھیری جھاڑیوں اور بیلوں کے جال سے گذرنا پڑا۔ کانٹوں اور خار دار جھاڑیوں نے جسم لہولہان کر دیئے۔ کہیں دَل دَل ...... اور کہیں سر بہ فلک چڑھائیاں۔ اور پھر ہر روز کی بارش، جس میں بھیگ کر زمین پر پڑی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں کا دبیز فرش بھبھک اٹھتا، اور راتوں کو اس میں سرسراتے ہوئے سانپوں اور کیڑوں کی آوازیں جنگلی جانوروں کی آوازوں سے زیادہ ڈراونی لگتیں ـــــ مگر انہوں نے سارا فاصلہ طے کر ہی لیا۔ وطن پہنچ ہی گئے۔ کیونکہ اکٹھے تھے۔

مگر جب آگ راون کے جزیرے میں ہر طرف پھیل گئی۔ اور مکان سے شعلے بلند ہونے لگے، تو سب لوگ بدحواسی میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، جیسے بل سے نکل کر چیونٹے۔ اور پھر ان پر گولیاں برسنے لگیں ـــــ تڑاتڑ۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہوتے گئے۔

وہ کیلوں کے باغ میں حق دق کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ وہ بھی وہیں جا رہا تھا، اسی مکان میں۔ بس ذرا سا فاصلہ رہ گیا تھا، ـــــ وہ اس سے ملنے جا رہا تھا۔

اور پھر یک لخت وہ سہم گیا۔ سرد لہر اوپر سے نیچے تک کاٹتی گذر گئی! چیخنا چاہا، مگر آواز حلق سے نہ نکل سکی۔ دھڑکتے دل اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک دو قدم چلا تھا، کہ کسی نے اسکی بانہہ پکڑ لی۔

'کہاں جاتے ہو؟ ـــــ فول؟ دیکھتے نہیں؟' وہ نندن تھا۔

'مگر .... مگر وہ .... ؟'

'اسے بھول جاؤ ـــــــ اب وہ نہیں رہی'۔

'کیا .... کیا ہوا اسے ؟' اس نے کہنا چاہا۔ مگر آواز سہم کر رہ گئی .....

مکان کا ایک حصہ جل کر گر رہا تھا۔ بانسوں اور ٹٹیوں کے چٹخنے کی آواز آرہی تھی۔

'پتہ نہیں .... جل گئی یا .... وہ لوگ لے گئے'

'نہیں ـــــــ' وہ سن سے رہ گیا۔ جیسے برف کی سل میں دھنستا جارہا ہو ـــــــ مفلوج ذہن میں الفاظ منجمد ہو کر رہ گئے ـــــــ نہیں۔ اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ وہاں سے نکل گئی ہوگی'....... تم اس کے بھائی ہو' مگر اسے نہیں جانتے ؟ .... بے وقوف؟'

اور پھر نندن' پتہ نہیں کیسے اور کہاں کہاں اسے لئے لئے پھرا۔ وہ بغیر کسی مزاحمت کے اسکے ساتھ پھرتا رہا' بچے کی طرح۔ اور پھر وہی اسے جزیرے سے نکال لایا' جان پر کھیل کر۔

وہ آنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا' وہ اسے وہیں کہیں تلاش کرلے گا۔ وہ بھی اسے تلاش کر رہی ہوگی۔

مگر اس شہر میں آکر اس کی تلاش اور بھی شدید ہوگئی۔ اسے احساس ہو چلا تھا' وہ بھی جزیرہ چھوڑ کر یہیں آگئی ہے ـــــــ

اور پھر ایک دن وہ مل بھی گئی !

سمندر کے کنارے' ایک معمولی سے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا' کہ وہ برابر کی کرسی پر آبیٹھی۔ کپکپاتے ہونٹوں پر پُر اسرار مسکراہٹ تھی۔

"ہلو ـــــــ آخر تم مل گئے!"

وہ چونک گیا ـــــــ "تم کہاں تھیں اتنے دن ؟ مجھے اتنا کیوں ستایا؟"

"میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا ـــــــ مگر پاس نہیں آئی۔ تمہاری سلامتی کے لئے"

"سلامتی !....... یہاں' اس شہر میں؟"

"ہاں .... کون جانے!"

اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا ـــــــ "اوہ۔ آخر تم مل گئیں۔

——— میں کتنا پریشان تھا! ..... اور تمہارا بھائی نندن، ..... کتنا بے وقوف ہے!"

وہ کھِل کھلا کر ہنس پڑی ——— "بے وقوف!"

اور پھر ہر طرف وہی کاسنی اور بنفشی موجیں بکھر گئیں، ..... بڑے عرصے بعد۔

اور جب وہ تحلیل ہونے لگیں تو اس نے اسی پر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا ——— "بتاؤ اس دن وہاں تم دیر سے کیوں آئے؟"

"میں کیلوں کے باغ میں رک گیا تھا۔ اچھا بتاؤ، تم نے ان لوگوں کو دیکھا تھا؟ ——— ان کے پاس سٹین گنیں تھیں، اور مشعلیں بھی۔ وہ کون لوگ تھے؟....."

مگر جواب سے پہلے ہی وہ جا چکی تھی۔ چپ چاپ، جیسے آئی تھی۔ ان چند لمحوں میں اسے خوشی بھی دے گئی، اور اداس بھی کر گئی۔

اس دن نندن ملا تو اس نے پوچھا ——— "نندن۔ اس دن جزیرے میں وہ کون لوگ تھے، ..... مکان جلانے والے، ..... گولیاں برسانے والے؟"

"پتہ نہیں چل سکا"

"کیا وہ دشمن تھے؟"

"پتہ نہیں۔"

"تو کیا پھر دوست تھے؟"

"کچھ پتہ نہیں ..... اور پھر اب کرنا بھی کیا ہے معلوم کر کے؟" نندن بولا

"——— وہ ہمارا وطن تھا!" اس نے بہت آہستہ سے کہا۔

"فول! وطن سے کیا ایسے بھاگنا پڑتا ہے؟"

"تو کیا ——— یہ ہے ہمارا وطن؟"

"نہیں معلوم ———" نندن نظریں پھیر کر بولا۔

"بے وقوف ——— گدھے۔ تجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ تیری بہن اس شہر میں ہے تجھے یہ بھی نہیں معلوم! تجھے سوچ لینا چاہیئے کہاں رہے گا اسے لے کر؟"

نندن چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا؛ اور اس کی نظریں اس میں پیوست ہوئی

جا رہی تھیں ـــــــ جیسے اس کے آر پار دیکھ رہا ہو ۔

اور پھر وہ اسے کئی دفعہ ملی ۔ اسی طرح چند لمحوں کے لئے اس کی زندگی میں پھول کھلا دیتی ، اور ان کے رنگوں کے سحر سے ابھی نکلنے بھی نہ پاتا کہ اسے پھر اداس چھوڑ جاتی ۔

کبھی کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی گود میں دور تک چلے جاتے ۔ کبھی دور دراز ساحلوں کی ریت پر بیٹھ کر ناریل کا پانی پیتے ۔ اور کبھی کسی شاندار ہوٹل کی لان پر شام کا وقت گذار دیتے ـــــ کبھی مہمان بن کر ، اور کبھی میزبان بن کر ! وہ اچھی طرح جانتی تھی ، اسے کون سی چیزیں پسند ہیں ۔

اور پھر ایک دن یہ ہوا کہ جس بلڈنگ میں وہ اور اس کے ساتھی ٹھیرے ہوئے تھے ، کچھ اجنبی لوگ گھس آئے ۔ اور اندھا دھند گولیاں برسانے لگے ۔ وہ بھی ان کی زد میں آگیا ، بری طرح !

ہسپتال میں جب اسے ہوش آیا ، تو نندن سرہانے بیٹھا ہوا تھا ۔ ڈاکٹر اور نرسیں گم سم سے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے ۔ نندن نے اپنے بے رنگ چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ لاکر کہا ـــــ " مالتی آئی تھی ، ــــــ تمہیں دیکھنے ۔ ابھی ابھی گئی ہے ۔ "
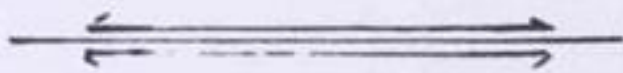
تہہ در تہہ

—— نگاہ روبرو، باادب، شہنشاہِ ہند تخت پر جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔

امورِ سلطنت پیش ہوں، وزیرِ اعلیٰ۔

حضور۔ آج دربار میں ایک باغی سردار پیشِ خدمت ہے۔ اس نے عالم پناہ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ علمِ بغاوت بلند کر کے شاہی جلال کو للکارا ہے۔ ارشاد ہو، اس غدار کو کیا سزا دی جائے؟

آپ کے خیال میں کون سی سزا مناسب ہو گی؟

غلام کی رائے میں، کڑی سے کڑی سزا اس کے جرم کی تلافی نہیں کر سکتی۔

ہم وزیرِ اعلیٰ کی رائے سے متفق ہیں۔ اور اس غدار کو عمر بھر کے لئے ...... جلاوطنی کی سزا دیتے ہیں۔

گستاخی معاف حضور۔ یہہ سزا تو بہت ہلکی ہے!

نہیں وزیرِ اعلیٰ۔ یہہ بہت بڑی سزا ہے۔ قتل کی سزا سے بھی سخت۔

یہہ کیسے ممکن ہے؟

ممکن نہیں، حقیقت ہے .... لے جاؤ۔ اسے جلاوطن کر دو۔

غلام کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے، یہہ کیسی حقیقت ہے! ..... کیا حضور والا سمجھا سکیں گے؟

اور اس کے بعد کھیل رک گیا۔

یہہ سوال منجمد ہوکر فضا میں معلق ہوگیا ——— یہہ سزا سب سے سخت کیسے ہے؟ کوئی کچھ نہہ بتا سکا۔

بادشاہ نے سر سے پگڑ اتار دیا۔ اور قیدی کی طرف دیکھنے لگا۔

——— اب بتاتے کیوں نہیں؟' تم نے ہی تو لکھے ہیں یہہ ڈائیلاگ! ..... اب سمجھاؤ۔ ...... جلاوطنی سب سے بڑی سزا کیوں ہے؟

میرے ابا نے یہی بتایا تھا۔

مگر کیسے؟ ..... یہہ کیسے ہوسکتا ہے؟

چلو۔ چل کر پوچھتے ہیں۔

ہاں ، بچو۔ یہی درست ہے۔ راجا اور بادشاہ اپنے خطرناک دشمنوں کو ملک بدر کردیا کرتے تھے۔

قتل یا پھانسی کی سزا، کیوں نہیں دیتے تھے؟

خاموشی

تم نے پڑھا نہیں، بھگوان رام کی سوتیلی ماں نے بھی انہیں چودہ برس کے بن باس کی سزا دی تھی؟

مگر وہ صرف چودہ برس کی جلاوطنی تھی۔ عمر بھر کی نہیں .... ہمارے سوال کا جواب یہہ نہیں ہے۔

پھر خاموشی

ہر پل بوجھل ہوتی جانے والی خاموشی ———

قیدی نیچے کے ابا جواب نہیں دے سکے ' اس لئے کہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے بھی اپنے بڑوں سے سن رکھا تھا، اور بس ۔'کیوں' کبھی پوچھا نہیں تھا۔

ابا سوچ میں پڑ گئے، گہری سوچ میں۔

بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے ـــــ چراغ روشن ہو گئے۔ مگر وہ سوچ میں غرق رہے،

رات کی سرگوشیوں میں دنیا سو گئی ـــــ مگر وہ سوچتے رہے۔

اور پھر یہ ہوا کہ جب صبح کو سب لوگ جاگے، تو باغی بچے کے ابا وہاں نہیں تھے!

وہ اس سوال کا جواب لانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ کیونکہ رات کے پچھلے پہر

ان پر کھل چکا تھا کہ اس جواب کو پائے بغیر اب وہ کبھی سو نہ سکیں گے!

پہلے شمال، پھر جنوب چھان مارا، ـــــ مگر کہیں وہ حکیم دانا نہ ملا جو اس سوال کا

خاطر خواہ جواب سمجھا سکتا!

پھر جانب مغرب کوچ کیا۔ بحر و بر کھنگال ڈالے .... ایک ایک مرکزِ علم و دانش

کی سیاحت کی۔ دانش وروں کی خدمت کی۔ مگر گوہر مقصود کہیں ہاتھ نہ آیا۔

ڈرامانگار بچے کے باپ کا ذہنی خلفشار بڑھتا ہی گیا۔ جلا وطنی قتل سے بھی بڑی سزا

کیسے ہے؟ .... کون ہے جو اس کا جواب دے کر اس کے بے چین دل و دماغ

پر سے ندامت کا بوجھ ہٹا سکے؟

جو اس کی بے خواب آنکھوں کو پھر سے نیند سے ہم کنار کر سکے!

اس تلاش و جستجو میں زمانے بیت گئے۔

آخر میں اس نے مشرق کا رُخ کیا۔ باد و باراں کے حملوں، بھونچالوں، اور لوگوں کے

ہجوموں سے بچ بچا کر نکلنا بڑا کٹھن کام تھا۔ تاریک جنگلوں، زرد دلدلوں اور بنجر سرد ویرانوں

سے گذرنے میں نہ جانے کتنے دن لگ گئے!

تب کہیں جا کر مل گجے رنگ کا وہ پہاڑ نظر آیا جس پر ہوا کے جھکڑ گذرتے تو سیٹیاں

بجنے لگتیں۔

اسی پہاڑ کی ایک گپھا میں باغی سردار کے ابا کو وہ نورانی چہرے اور مقناطیسی آنکھوں

والے بزرگ ملے، جن کی سفید براق ڈاڑھی غار کے فرش کو چھو رہی تھی۔

ان کے چہرے کی جھریوں کی تہوں میں دیکھو تو لگتا جیسے روزِ ازل سے اب تک کے سارے رموز و اسرار ان میں پوشیدہ ہیں!

بچے کے ابا کو لگا جیسے اس کی آہٹ سے وہ بزرگ اپنی لمبی گہری نیند سے ابھی ابھی بیدار ہوئے ہیں۔

مسکرائے۔ اور بیٹھنے کو کہا تو لگا جیسے ویران اندھیروں میں اجالا کوند گیا۔ اور جیسے اس گپھا کی سنگلاخ چٹانوں نے آوازِ آدم کو پہلی بار سنا ہو۔ بیسیوں ابابیلیں پر پھڑپھڑاتی اندھیروں سے باہر اُڑ گئیں۔

—— ہاں۔ یہ سچ ہے۔ جلاوطنی سب سے بڑی سزا ہے۔ غربت میں آدمی ہر روز مرتا ہے، ہر روز جیتا ہے، ...... اگلے روز پھر جان کنی کے کرب سے گذرنے کو۔

مگر جب ایسا ہو کہ دیارِ غیر میں اُسے ساری آسائشیں میسر ہوں؟

تو بھی۔ چھوٹے ہوئے وطن کے خوابوں کا عفریت اس کا تعاقب کرتا رہتا ہے .....

... زندگی کے پیالے میں سے سارا رس چوس لینے کے لئے۔

وطن کے باہر آدمی جیتا ضرور ہے، مگر جینے کی خواہش کھو دیتا ہے۔

اور مرنا کوئی نہیں چاہتا۔

اس آگ میں انسان ہزاروں برس سے جل رہا ہے .... تم میری بات اتنی جلدی نہیں سمجھو گے۔ آؤ اب سو جاؤ۔ کل صبح میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ دیکھو گے تو یقین آجائے گا۔

بچے کے ابا سو گئے۔ اُس پہاڑ کے اُس غار میں جو ٹھنڈی ہوا سرسرا رہی تھی، اس کی تاثیر میں سحر تھا، خواب آور، لائم لوریوں جیسا!

نیند میں انہیں محسوس ہوا جیسے ان کا وجود، ایتھر جیسی سیال شئے میں تحلیل ہو گیا ہے۔ اور کائنات کی پہنائیوں میں وقت کے محور پر پیچھے کی طرف بہتا جا رہا ہے!

دراز ریش والے بزرگ نے انہیں جگایا۔ اور دونوں روانہ ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں دونوں

ہمالہ کی برفیلی چوٹیوں کے تلے، شراوستی، کپل وستو، سارناتھ اور ویشالی کے دیس میں پہنچ گئے۔

وقت کا پہیہ جہاں جاکر رکا تھا، وہ سدھارتھ کا زمانہ تھا، جب وہ مقدس سمبودھی کے بعد بُدھا بن چکے تھے۔

لوگ زعفرانی چادریں لپیٹے، سر کے بال کٹوائے، جوق درجوق خانقاہوں اور وہاروں کو آباد کر رہے تھے۔ راہبانہ زندگی نے خواہشوں کا لبادہ اتار پھینکا تھا۔ گھر کے بندھنوں کو توڑ کر انسان آزاد ہو چکا تھا۔

جنگل اور پہاڑ اس کے گیان دھیان کے استھان بن چکے تھے۔

بچے کے باپ نے حیران ہوکر پوچھا ——— تو یہ راہب اپنے گھر، اپنے دیس چھوڑ کر سکھی کیسے ہیں؟ کیا انہوں نے دکھوں سے نجات پالی؟

ہاں۔ خواہشوں کو کچل کر ——— ! ...... سنو۔ آواز آرہی ہے:

——— دکھ اصل ہے، اور خوشی ایک پھسلتا ہوا سایہ، جس کے گذر جانے کا ڈر ہر دم لگا رہتا ہے۔ ہر خوشی اپنے پیچھے محرومی کا احساس چھوڑ جاتی ہے ...... گویا دکھ کی جڑ ہے خوشی، خوشی کی پیاس۔

اور پھر بچے کے باپ نے دیکھا ——— بھگوان بدھا نے اپنے سات جنموں کے بعد، مہاپری نروان حاصل کر لیا ہے۔ اور ان کے ہونٹوں پر فتح کی مسکراہٹ ہے!

مگر ——— مہاپری نروان پانے سے پہلے ایک بار وہ اپنے گھر گئے تھے.......

..... اپنے دیس، اپنے وطن! وہی جسے تیاگ دیا تھا! اور یہی بات بتانے، بلکہ دکھانے کے لیے تمہیں یہاں لایا ہوں۔

دیکھو ———

بھکشو کے لباس میں محل کے دروازے پر وہ مہاتما بدھ کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں کاسہ ہے۔ رانی ان کے نوعمر لڑکے کو لے کر بھکشو کو دان دینے آئی ہیں۔ دروازے پر بھکشو اور رانی

کی نظریں مل رہی ہیں۔ پہچان کی چمک ابھر آئی ہے۔

ہوا گن گنا رہی ہے ——— "دیکھو ری اک بالا جوگی دوار ہمارے آیو رے"۔

اور پھر زمین کی جڑوں نے پاؤں جکڑ لئے۔ کئی دن تک وہ پاؤں محل کے در و دیوار چھوڑ کر باہر نہ نکل سکے، جن میں ان کی جوانی اور بچپن کی خوشبوئیں رچی بسی تھیں۔

——— قیدی بچے کا باپ اس تصویر کے ہر نقش کو محویت کے عالم میں دیکھ رہا تھا، جو وقت کے سیل رواں میں ایک منجمد لمحے کی طرح اس کے سامنے رکی کھڑی تھی!

تم نے کبھی پھلے پھولے درخت کو اکھیڑ کر نئی زمینوں میں لگانے کی کوشش کی ہے؟

——— باپ نے پلٹ کر دیکھا، لمبی ڈاڑھی والے بزرگ وہاں نہیں تھے۔ اس نے آسمان پر نظر کی — وہ واپس جا رہے تھے۔ مل گجے رنگ کے پہاڑ کی سمت۔ ۵۸
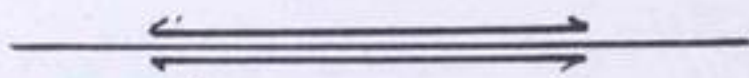
وقت کا بوجھ
پتھریلی چپ
اونچے اونچے پہاڑ
میں پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی گھاس پر
پتی پتی کی تحریر پڑھتا ہوں اسرار میں غرق ہوں

(قاضی سلیم)

اینی

میں اس جگہ نیا نیا آیا تھا۔ بلڈنگ میں رہنے والے اکثر لوگوں سے واقف نہ ہو سکا تھا۔ یہ ایک اوسط درجے کی سہ منزلہ عمارت تھی اور میرا کمرہ اوپر کی منزل میں سرے پر واقع تھا۔ دیکھ بھال اور مرمت باقاعدگی کے ساتھ نہ ہونے سے عمارت بوسیدہ ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ دیواروں پر سے پلسٹر جھڑ گیا تھا۔ پھر بھی یہ جگہ مجھے اس لئے پسند آئی کہ بمبئی کی گنجان آبادی سے دور ناریل کے اونچے اونچے درختوں میں گھری ہوئی سمندر کے قریب واقع تھی۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ ویسٹرن ریلوے کی لوکل بیس منٹ میں چرچ گیٹ پہنچا دیتی تھی۔

بلڈنگ کی مالک ایک عورت تھی جسے سب لوگ میڈم کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا اصل نام مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کا فلیٹ میرے کمرے کے قریب ہی تھا۔ کرائے وغیرہ کے سلسلے میں دو ایک بار اس سے ملنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ چھوٹے سے قد کی کمزور جسم والی عورت تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ فراک پہنتی تھی۔ جس میں سے سوکھے سوکھے ہاتھ پیر یوں نکلے رہتے، جیسے کسی ٹھنٹھ پر بچی ہوئی دو ایک ننگی شاخیں! گالوں کی ہڈیوں پر نکل کے فریم کی عینک ٹکی رہتی جس کے اندر سے دو مغموم آنکھیں بجھتے ہوئے چراغوں کی مانند ٹمٹماتی رہتیں۔ اس کی بے رنگ آنکھوں کو غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا جیسے ان میں صدیوں کے غم اور دکھوں کی داستانیں جذب ہوں۔ بے پناہ غم کا یہی احساس اس کے چہرے پر جھریوں کے گہرے جال کو دیکھنے سے بھی ہوتا تھا۔ جیسے ان آنکھوں نے تمام عمر دکھوں کے دھارے بہا بہا کر چہرے کو سیراب

کیا ہو ..... اور اب جب کہ یہ دھارے اپنی تمام متاع لٹا کر سوکھ گئے تو یہ سرزمین بھی خشک ہو کر تڑخ گئی اور بے شمار لکیروں کا جال چہرے پر چھوڑ گئی۔ میڈم کے نوکر جان نے مجھے بتایا تھا کہ میڈم کی تمام عمر غم جھیلتے اور دکھ سہتے گذری ہے۔ عرصہ ہوا جب اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ...... اس بلڈنگ کے سہارے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو لکھایا' پڑھایا۔ بڑا ہو کر وہ ایئر فورس میں بھرتی ہو گیا۔ وہ ہوائی جہاز چلانے کی مشق حاصل کر رہا تھا اور جب اس کی اڑان کے صرف سات گھنٹے باقی رہ گئے تھے' وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا! اس غم نے میڈم کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ بیٹے کی تعلیم اور پوزیشن کی خاطر اس نے بلڈنگ رہن رکھوا دی تھی' اس امید پر کہ جب وہ پائلٹ افسر بن جائے گا تو بلڈنگ بھی چھوٹ جائے گی۔ لیکن یہ خواب پورا نہ ہو سکا اور اب ہر مہینے بلڈنگ کی آمدنی کا بڑا حصہ گجراتی سیٹھ کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ نہ جانے کس دن آ کر وہ اس پر پورا قبضہ جما لے!

...... میڈم کی داستان سن کر مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

میڈم کا کمرہ پرانی وضع کے بیش قیمت لیکن بوسیدہ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دیوار پر اس کے شوہر کی تصویر لٹک رہی تھی اور ایک طرف مینٹل پیس پر ایک خوش رو نوجوان کی تصویر رکھی تھی ..... کوئی بیس بائیس کی عمر' مسکراتا ہوا چہرہ' ہونٹوں پر باریک مونچھوں کی لکیر۔ یہ اس کا بدنصیب بیٹا ہو گا۔ میں نے سوچا تھا۔ اس ملاقات میں میڈم سے اس کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی وہ مجھ سے بڑی شفقت اور خلوص سے ملی۔ میرے بارے میں بہت سے سوالات پوچھے۔ کبھی کبھی مسکرا اٹھتی تو چہرے پر چھایا ہوا حزن اور نمایاں ہو جاتا .....

"جب کبھی کمرے میں اکیلے پڑے پڑے اکتا جاؤ تو یہاں آ جانا۔ تم سے باتوں میں میرا بھی جی بہل جائے گا ....." جاتے وقت اس نے مجھ سے کہا تھا۔

اس دن آسمان پر صبح سے بادل چھا رہے تھے۔ تھوڑی دیر سے بارش بھی ہونے لگتی۔ بھیگی ہوئی ہوا کے بوجھل جھونکے اپنے ساتھ نمی اور خنکی کمرے کے اندر تک لے آئے تھے۔ میں ناشتے کے بعد خلاف معمول کمرے میں ہی تھا۔ موسم ایسا

غیر یقینی سا ہو رہا تھا کہ باہر نکلنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ ویسے اس دن کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں تھی۔ آرام کرسی پر دراز میں کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ ہلکے نیلگوں کہر میں لپٹا ہوا سارا شہر عجیب پر اسرار سا لگ رہا تھا۔ دور تک شہر کی بلند عمارتوں، کارخانوں کی چھتوں اور گھنٹہ گھروں کے نقش دھند کے غلافوں میں لپٹے مدھم مدھم سے نظر آرہے تھے۔ نیچے سڑک بھی خالی خالی پڑی تھی۔ کبھی کوئی تیز رفتار موٹر گزر جاتی تو بھیگی ہوئی سڑک پر سیٹی کی آواز دور تک اس کے تعاقب میں دوڑتی جاتی اور کچھ دیر کے لئے خاموشی اور جمود کا احساس ٹوٹ جاتا۔

میں سوچنے لگا دن کیسے گزرے گا۔ دن بھر کھڑکی میں سے باہر کا نظارہ کرتے تو نہیں گزر سکتا! ...... اور ٹھیک اسی وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جاکر دیکھا تو میڈم کا نوکر جان کھڑا تھا۔

"آپ کہیں باہر جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں .... کیوں؟" میں نے جواب دیا۔

"آپ ...... برج کھیلنا جانتے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" شاید میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا جان نے فوراً معذرت چاہتے ہوئے جواب دیا۔ "معاف فرمائیے ...... میڈم نے کہا ہے اگر آپ مصروف نہ ہوں تو کچھ دیر برج کھیلنے تشریف لائیے۔"

"برج کھیلنے؟!——" میرے منہ سے نکلا۔ میڈم کی تاش سے دلچسپی کچھ عجیب معلوم ہوئی .... "اچھی بات ہے میں ابھی آتا ہوں۔ میں نے جان سے کہا۔ میڈم کی بات ٹالنا اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اور پھر اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ...... باقی دو پارٹنر کون ہیں؟ میں اور میڈم اکیلے تو برج نہیں کھیل سکتے! ..... چنانچہ جان کو روک کر پوچھ ہی لیا کہ کون کون آرہے ہیں۔؟

"اور کوئی نہیں آرہا۔" اس نے جواب دیا۔ "چوتھا پارٹنر میں بن جاؤں گا۔ باقی آپ میڈم اور امینی موجود ہی ہیں۔" مجھے نہیں معلوم تھا کہ ضرورت پڑنے پر جان

چوتھا پارٹنر بن سکتا ہے!

"اینی کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ یہ نام میرے لئے نیا تھا۔

"آپ نہیں جانتے؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "..... اوہ! شاید آپ ان سے ملے نہیں ہیں۔ اینی میڈم کی بہو ہیں۔"

"میڈم کی بہو!" میں نہیں جانتا تھا کہ میڈم کی بہو بھی ہے۔ میں نے تو سب سے یہی سنا تھا کہ مائیکل کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی اتنی کم عمر میں کون شادی کرتا ہے! ...... جان کے جانے کے بعد میں اینی کے بارے میں سوچتا رہا۔

اور جب اینی کو دیکھا تو یاد آیا کہ اسے اس سے پہلے بھی دو تین بار دیکھ چکا ہوں۔ اس بلڈنگ میں سیڑھیوں پر آتے جاتے .... یا شاید نیچے فٹ پاتھ پر۔ اس وقت میں سمجھا تھا کہ وہ بھی اسی بلڈنگ میں کہیں رہتی ہوگی۔ وہ کپڑے بڑے سلیقے سے پہنتی تھی ان کے لحاظ سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو بڑی خوبی سے سجاتی ...... شاید یہی وجہ تھی جو میں اُسے یاد رکھ سکا۔ ورنہ یوں وہ ایسی غیر معمولی حسین نہیں تھی۔ بس متناسب جسم اور گوارا خد و خال کی وہ ایک اینگلو انڈین لڑکی تھی۔ کھلتا ہوا رنگ، عمر کوئی پچیس برس .... اس دن اس نے پیازی رنگ کا ایک خوبصورت فراک پہن رکھا تھا۔

میں جب میڈم کے یہاں پہنچا تو وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھی تھیں۔ میڈم کے سامنے دو سرخ اونی گولے پڑے تھے۔ ہاتھ میں سلائیاں گھوم رہی تھیں۔ اینی ایک کاپی پر جھکی ہوئی پنسل سے کچھ لکھتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میڈم بولی...... "چلو اینی رکھ دو.... اب یہ گھر کا حساب کتاب بعد میں کرنا۔ ان سے ملو..... یہ ہیں رشید۔ اور یہ ہے اینی، میری بچی۔" نکل کے فریم میں جڑے ہوئے عینک کے مدھم شیشے ایک لمحے کے لئے چمک اٹھے۔!

"میری بچی۔" میڈم نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ جیسے کوئی سچ مچ کی ماں اپنی بچی کے لئے کہہ سکتی ہے۔ اینی نے مسکراتے ہوئے کاغذ قلم ایک طرف رکھ دیا اور

مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسکراتے وقت اس کا چہرہ بڑا دلآویز ہوجاتا ہے۔ جیسے مسکراہٹ اس کی ہستی کا ایک بڑا ضروری جزو ہے! تعارف کے بعد تھوڑی دیر موسم اور بارش کا ذکر ہوتا رہا۔ اس دوران میں جان نے میز پر تاش جما دیئے۔ اور پھر برج شروع ہوگیا۔ جان بھی شریک رہا۔ وہ اچھا خاصا کھلاڑی تھا بلکہ شاید ہم میں وہی بہتر تھا۔ میڈم بڑے انہماک اور دلچسپی سے کھیل رہی تھی۔ اس کی حرکتوں سے بچوں کا سا شوق ظاہر ہو رہا تھا۔ زیادہ تر وہی میری پارٹنر رہی۔ چوتھے یا پانچویں ربر کے بعد اینی جان کو ساتھ لے کر چائے کا انتظام کرنے اندر چلی گئی۔ وہ میڈم کے گھر میں جس بے تکلفی سے گھوم پھر رہی تھی اسے دیکھ کر میں میڈم سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا وہ انہی کے ساتھ رہتی ہے؟

"نہیں ——" میڈم نے جواب دیا۔ "وہ سینٹرل ہاسپٹل میں رہتی ہے۔"

"سینٹرل ہاسپٹل"!

"ہاں - وہاں وہ نرس ہے ..... اس کا کوارٹر ہاسپٹل کے احاطے میں ہی ہے۔ فرصت ہوتی ہے تو یہاں آجاتی ہے۔"

اینی کے بارے میں میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ میں سوچنے لگا کیا واقعی میڈم کی بہو ہے! کچھ دیر رک کر میں نے پوچھا۔ "وہاں ہاسپٹل میں کیا وہ اکیلی رہتی ہے؟ ...... میرا مطلب ہے اس کے ماں باپ ......"؟

"نہیں اکیلی رہتی ہے۔" میڈم نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ "...... میرے سوا اب اس کا ہے بھی کون؟!"

اس کے بعد پھر چند منٹ خاموشی رہی۔ آخر ہمت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا ..... "میڈم کیا اینی آپ کی بہو ہے؟"

میڈم نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ اس کی بے رنگ، اداس آنکھیں، بے چین اور مضطرب سی نظر آرہی تھیں ...... "ہاں اینی میری بہو ..... میری بچی ہے ... کیا تمہیں نہیں معلوم؟" اس نے آہستہ سے کہا۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔ اسکی

آواز کانپ رہی تھی۔ گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ کیونکہ امینی واپس آگئی تھی۔ ساتھ ہی جان بھی چائے اور کچھ پیسٹری بسکٹ وغیرہ لئے آپہنچا۔ چائے بناتے ہوئے امینی بولی

"مسٹر رشید۔ آپ کی وجہ سے آج برج کا لطف آگیا۔ ورنہ عام طور پر ہم تینوں کٹ تھروٹ ہی کھیلتے ہیں...... آپ کو نہیں معلوم میڈم کو برج سے بڑی دلچسپی ہے!"

"تمہیں بلانے کا خیال دراصل امینی کو ہی آیا تھا۔" میڈم کہنے لگی۔ اس کی آواز اب درست ہوگئی تھی...... کہنے لگی کیوں نہ آج کسی چوتھے پارٹنر کو تلاش کیا جائے؟ میں نے تمہارا ذکر کیا تو مصر ہوگئی کہ فوراً بلاؤ۔

"بہرحال آپ نے اچھا کیا جو مجھے بلایا...... ورنہ کمرے میں پڑے پڑے وحشت ہونے لگی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ یہاں بمبئی میں کیا کام کرتے ہیں؟" امینی نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ تر بیکار ہی رہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "کبھی کبھار موقعہ ملتا ہے تو کسی فلم کے ڈائیلاگ لکھ دیتا ہوں۔"

"اوہ..... تو آپ بھی فلموں کے چکر میں بمبئی پہنچے ہیں؟" وہ بولی

"یہی سمجھ لیجئے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ مجھے فلموں کی شوٹنگ اور اسٹوڈیوز دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک دن آپ کے ساتھ چل کر دیکھنا ہی پڑے گا!" امینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ضرور...... لیکن وہاں جاکر آپ کو ایکٹنگ کا شوق نہ ہوجائے!"

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ میڈم اور امینی بھی ہنس پڑے۔ جان بھی میز کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کمرے میں جہاں ہمیشہ خاموشی اور اداسی چھائی رہتی تھی ہنسی کی آوازیں اجنبی سی لگ رہی تھیں!

چائے کے بعد ہماری یہ محفل ختم ہوگئی۔ میں خوش تھا کہ میری وجہ سے ان سب

لوگوں کا وقت اچھی طرح گزرا ..... خاص طور پر میڈم کا ! امینی مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی۔ دروازے پر رک کر آہستہ سے کہنے لگی۔

"رشید صاحب ...... آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ نہیں جانتے کتنے دن بعد میڈم کے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہے۔ !"

خود امینی کی آنکھیں حقیقی مسرت سے چمک رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں آ کر میں سوچنے لگا کیا سچ مچ امینی کو میڈم سے اتنی محبت ہے؟ میڈم کی اک ذرا سی خوشی پر وہ کتنی مسرور نظر آ رہی تھی ! اور پھر میں میڈم کے ہاں اس کی اصل حیثیت کے بارے میں غور کرنے لگا ..... کیا واقعی وہ میڈم کی بہو ہے؟ بہت دیر تک میرے ذہن میں یہی سوالات گھومتے رہے۔ کبھی خیال آتا کہیں یہ ساری محبت میڈم کی بلڈنگ کے لئے تو نہیں ہے ! میڈم کے بعد اس کا وارث کوئی تو ہو گا ہی ! لیکن پھر فوراً یہ خیال ذہن سے نکل جاتا۔ سب جانتے تھے کہ میڈم کی مالی حالت بہت بری ہے۔ یہ بلڈنگ بھی اب اس کی نہیں رہی تھی ..... بہرحال امینی میرے لئے معمہ بنی رہی۔

دوسرے دن صبح مجھے ایک ضروری کام تھا۔ اس لئے سویرے ہی کمرے سے نکل گیا۔ نیچے پان والے کی دکان سے سگریٹ خرید رہا تھا کہ امینی نظر آئی۔ وہ بھی بلڈنگ سے نکل کر تیز تیز قدموں سے سامنے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت بڑی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ وہ جلدی میں تھی اس لئے میں نے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ پل پار کر کے وہ لائن کے دوسری طرف پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ ایک دو منٹ بعد ہی لوکل آ گئی اور وہ چلی گئی ..... اور میں سوچتا رہا کہ آخر وہ کونسی کشش ہے جو امینی جیسی لڑکی کو اتنی دور سے کھینچ کر یہاں میڈم کے پاس لاتی ہے اور وہ اپنی چھٹی کے قیمتی دن اور راتیں یہیں گزار دیتی ہے !

اس کے بعد بہت دنوں تک امینی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں ان دنوں زیادہ مصروف رہا۔ کمرہ پر بہت کم وقت گزرتا تھا۔ ایک دن دوپہر کو چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن سے نکل رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا۔ "ہلو۔ رشید صاحب !" مڑ کر دیکھا تو امینی ایک دکان سے اتر کر آ رہی تھی ..... ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ لئے جس کے بغیر اس کا سارا

حسن بے رنگ تھا قریب آ کر بولی۔

"کہئے اچھے تو ہیں آپ؟ ...... آپ تو اس دن کے بعد سے ایسے غائب ہوئے کہ آج نظر آئے ہیں!"

"اور آپ ہی کونسی نظر آتی رہی ہیں اس کے بعد سے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں تو اس دوران میں کئی مرتبہ میڈم کے پاس آئی ہوں۔ دو مرتبہ جان کو بھیجا بھی تھا آپ کے لئے ...... لیکن ہر بار آپ کا کمرہ بند ملا۔!" وہ بولی۔

"اوہ ...... تو پھر تو مجھے آپ سے معافی مانگنی چاہئیے!" میں نے جواب دیا۔" دراصل ان دنوں ایک نئی جگہ کوشش کر رہا تھا کہ کچھ کام بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ...... خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ پہلے یہ بتایئے کیا آپ کی شاپنگ ختم ہو گئی؟"

"ختم ہی سمجھئے۔ کوئی آدھے گھنٹے سے ہلکے سنہری رنگ کا اون تلاش کر رہی ہوں ...... گیہوں کی تازہ بالیوں کے رنگ کا۔ لیکن ابھی تک کہیں نہیں ملا۔ اور نہ اب یہاں کہیں ملنے کی امید ہے۔"

"کیا وہی رنگ ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں۔ بہت ضروری ہے ...... پورے دو مہینے محنت کر کے میڈم نے میرے لئے جو سویٹر بنا ہے اس میں پھولوں کے ڈیزائن کے لئے یہی رنگ موزوں ہے۔"

"خیر اون تو ملا نہیں ...... اب کیا ارادہ ہے؟ میں اس اون کے ذکر سے عاجز آ گیا تھا۔

"ارادہ؟ ۔" اس نے چونک کر ہاتھ کی گھڑی دیکھی۔" ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مجھے ہاسپٹل واپس پہنچ جانا ہے۔"

"آدھے گھنٹے میں ایک پیالی چائے بہ آسانی پی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا "چلئے اس سامنے والے ریسٹوران میں بیٹھ کر باتیں بھی ہو سکیں گی۔"

وہ بغیر کسی تامل کے تیار ہو گئی۔ ریسٹوران میں داخل ہوتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ آج اپنی سے اس کے اور میڈم کے بارے میں ضرور پوچھوں گا۔ لیکن جب ہم بڑے

ہال کے چکنے فرش پر سے گزر کر دوسری طرف ایک علاحدہ میز پر جا بیٹھے تو بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو شروع ہی نہ ہو سکی۔ بالآخر میں نے رکتے رکتے پوچھا.......

"مس اینی۔ میڈم سے..... آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں..." مختصر سا جواب تھا۔

"تو کیا آپ ان کی بہو نہیں ہیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

وہ چند لمحے خاموشی سے میرے چہرے کو دیکھتی رہی۔ مسکراہٹ کی جگہ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی!...... آخر آہستہ سے بولی ـــــ ہوں بھی... ..... اور نہیں بھی!"

عجیب جواب تھا۔ میں چپ ہو گیا، سوچنے لگا کہیں میرے اس طرح پوچھنے پر برا تو نہیں مان گئی! ویٹر چائے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا تھا۔ اینی چپ چاپ چائے بنانے لگی..... بالآخر یہ بھدّی خاموشی ٹوٹی۔ میری طرف دیکھے بغیر اس نے کہنا شروع کیا........

مسٹر رشید۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے جو اس زمانے سے شروع ہوتی ہے جب مائیکل زندہ تھا۔ مائیکل......... میڈم کا اکلوتا لڑکا....... میرا منگیتر! وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہی مجھے پہلی بار میڈم سے ملانے لے گیا تھا اور پھر میں اکثر ان کے یہاں آنے جانے لگی...... مائیکل بڑا جذباتی تھا۔ بچوں کی طرح بات بات پر روٹھ جاتا۔ اور پھر جلد ہی من جاتا۔ کبھی کبھی اس کی یہ جذباتیت تکلیف دہ بن جاتی تھی۔ پھر بھی میں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ اس کا دل نیک اور محبت سے بھرپور تھا۔ میڈم کو اس سے بہت محبت تھی..... ہر ماں کو اپنے اکلوتے بیٹے سے ہوتی ہے۔ لیکن میڈم کی محبت کچھ زیادہ ہی تھی! شاید مائیکل کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کا غم بھی بھول بیٹھی تھی۔ وہ مجھے بے حد پسند کرنے لگی۔ اسے ہر وہ چیز پسند تھی جو مائیکل کو پسند تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس نے اسے ایئر فورس کی ٹریننگ کی اجازت بھی دے دی! ٹریننگ کے بعد ہماری شادی طے ہو چکی تھی۔ میڈم ساری تیاریاں پہلے ہی کر چکی تھی۔ لیکن جب مائیکل کی اڑان کے صرف سات گھنٹے

باقی رہ گئے تھے تو ...... تو ...... آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

"میں جانتا ہوں مس اینی ......" میں نے اس کی مدد کرنی چاہی۔

"نہیں آپ نہیں جانتے!" اس نے کہیں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ آواز ابھی تک کانپ رہی تھی۔ "اس دن میڈم کی حالت کا آپ کچھ بھی اندازہ نہیں لگا سکتے! ...... وہ بہت بڑا صدمہ تھا ...... بہت بڑا! ناقابلِ برداشت! کئی دن تک تو میڈم نے یہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ مائیکل زندہ نہیں ہے! شاید آپ کو نہیں معلوم کہ حادثے کے بعد مائیکل کے جسم کے ٹکڑے بھی نہ مل سکے!"۔

اس تکلیف دہ موضوع کو چھیڑ کر اب میں پچھتا رہا تھا۔ وہ کئی سکنڈ تک نظریں جھکائے چائے کی پیالی کو گھورتی رہی۔ اور پھر ایک دم اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے ان کی گہرائیوں میں مائیکل کی محبت پھر ایک بار جاگ اٹھی ہو! پھر ایک بار ان نہاں خانوں میں یادوں کے شعلے کوندنے لگے ہوں؟ یہ آگ، یہ شعلے بجھ نہ سکیں گے، میں نے سوچا۔ یہ آگ کبھی سرد نہ ہو گی! ...... اینی کہہ رہی تھی ......

"مائیکل کی موت سے میڈم پاگل ہو گئی تھی۔ اس کے ہوش و حواس جلتے رہے تھے۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ یہ حالت اور دو چار دن رہی تو یہ بچ نہ سکے گی۔ اس کا غم دیکھ کر میں اپنا غم بھول گئی۔ میرا دل اس کے لئے رحم، ...... بے پناہ رحم سے تڑپ اٹھا! اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے بچاؤں گی ...... میں اسے زندہ رکھوں گی۔ مجھے یاد ہے وہ دن جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا کہ آخر وہ اتنی پریشان اتنی مایوس کیوں ہے؟ اس کا بیٹا زندہ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ میں بھی تو بیٹی ہوں! میں مائیکل ہی تو ہوں! میں اس کے لئے زندہ رہوں گی۔ میرا بھی تو یہی گھر ہے!" اینی کہتے کہتے رک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اپنی باتوں کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتی ہو۔ میں بالکل خاموش تھا۔۔

چند لمحے سستا کر اس نے پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "مجھے یاد نہیں

اس دن میں نے کیا کیا کہا! لیکن اس کے بعد میڈم کی دماغی حالت میں ایک بڑا تغیر پیدا ہوگیا۔ اس کی حالت سنبھلتی چلی گئی ...... مجھے وہ نگاہیں اب بھی یاد ہیں۔ جن سے میڈم نے اس دن جیسے پہلی بار مجھے دیکھا تھا! جیسے وہ مجھے نہیں اپنے مائیکل کو دیکھ رہی ہو۔ رفتہ رفتہ وہ مجھے شدت سے پیار کرنے لگی۔ اب اس کی زندگی کا سہارا ہیں، ...
...... صرف میں ہوں اور رشید صاحب، یہ خیال مجھے کس قدر تسکین دیتا ہے .....
آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے! اب مجھے ذرا سا بھی موقع ملتا ہے تو میڈم سے ملنے چلی جاتی ہوں اس کے یہاں اس طرح رہتی ہوں جیسے وہی میرا اصلی گھر ہے۔ اور اس بات سے اُسے بے انتہا مسرت ہوتی ہے۔ فرصت ہوتی ہے تو رات کو بھی ٹھہر جاتی ہوں۔"

میں چُپ چاپ اس کے چہرے کو گھورتا رہا۔ کسی اندرونی مسرت سے اس کی آنکھوں میں نئی چمک آگئی تھی ...... "رشید صاحب میں نہیں جانتی کہ یہ رحم ہے یا کیا، جو مجھے میڈم کے ساتھ اس مضبوطی سے باندھے ہوئے ہے ..... اور اب اس کی گرفت سے نکلنا میرے بس سے باہر ہو گیا ہے!" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ریسٹوران سے نکلتے وقت پتہ چلا کہ اسے پندرہ منٹ کی دیر ہو چکی ہے۔

جب بھی موقع ملتا میں میڈم کے یہاں ضرور جاتا۔ دیر تک باتیں ہوتیں۔ دوران گفتگو میں وہ امینی کا ذکر بار بار کرتی۔ امینی پر اسے ناز تھا۔ اس کے ذکر پر اس کی آنکھیں غرور سے چمکنے لگتیں ..... ایک مرتبہ ایسے ہی کسی موقعہ پر اس نے کہا تھا۔ "میرے مائیکل کی پسند کوئی ایسی ویسی تھوڑی تھی!"

کبھی امینی بھی وہاں مل جاتی۔ ہم سب مل کر خوب باتیں کرتے یا پھر رمی اور برج کھیلتے رہتے۔ کبھی کبھی سارا دن وہیں گزار دیتا۔ امینی کا ہر چکر میڈم کے جسم میں ایک نئی طاقت، نئی روح پھونک دیتا۔ اور وہ چند دن اور دھکیلنے کے قابل ہو جاتی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب امینی کے بغیر اس کا ایک دن بھی زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔

اور پھر انہی دنوں ایک عجیب انکشاف ہوا ...... وہ ایک ابر آلود شام تھی۔ بارش ابھی ابھی رکی تھی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں، میں جوہو پر سمندر کے کنارے

ٹہل رہا تھا۔ اس دن میں ذہنی طور پر کچھ پریشان سا تھا اور یونہی وقت کاٹنے اِدھر آنکلا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو وہیں ریت پر بیٹھ کر بل کھاتی ہوئی موجوں کو دیکھنے لگا۔ اوپر بادلوں کے کنارے رنگین ہوتے جارہے تھے۔ غروبِ آفتاب کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ دور اُفق کے پاس آبی پرندوں کی لمبی لمبی قطاریں سرمئی بادلوں کے پسِ منظر میں شفق کی سرخی سے چمک اٹھی تھیں۔ میں ساحل پر دور تک پھیلے ہوئے ناریل کے درختوں کی قوسوں کو دیکھنے لگا۔ اس دن بیچ پر لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایسے میں ایک چھوٹی نیلے رنگ کی کار ناریل کے درختوں کے نیچے آکر رکی۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے اینی برآمد ہوئی۔ جو شخص موٹر چلا رہا تھا وہ بھی اتر آیا۔ اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئی تیس بتیس سال کا خوش پوش اور خوش وضع آدمی تھا۔ وہ دونوں اب سمندر کی طرف آرہے تھے۔ اینی کے خوبصورتی سے جمائے ہوئے بال بار بار ہوا سے بکھر جاتے اور وہ پھر انہیں درست کرلیتی۔ اس کی ہلکے سُرخ رنگ کی ساڑھی نے شام کی رنگینی میں اور اضافہ کردیا تھا۔ دونوں بے حد مسرور نظر آرہے تھے ...... خاص طور پر اینی۔ جسے عموماً میں نے خاموش اور اداس ہی دیکھا تھا۔

پتہ نہیں کیوں اینی کو وہاں اس حالت میں دیکھ کر میرے ذہن کو ایک دھچکا سا لگا۔ شائد اسے اس طرح دیکھنے کے لئے میرا ذہن پہلے سے تیار نہیں تھا...... مجھے یوں محسوس ہورہا تھا، جیسے ان لوگوں کو دیکھ کر میں نے کوئی برا کام کیا ہو! جی میں آیا کہ جلدی سے اٹھ کر کہیں چھپ جاؤں ...... لیکن ادھر اس دوران میں اینی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے پاؤں جیسے گیلی ریت میں دھنس کر رہ گئے تھے صرف ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار بکھر کر غائب ہوگئے اور اب پھر وہاں وہی معصوم اور دلکش مسکراہٹ پھیلتی جارہی تھی۔ جلدی جلدی میری طرف بڑھتے ہوئے پکار اٹھی۔

"ہیلو مسٹر رشید!" اور قبل اس کے کہ میں اٹھ کر حواس بجا کرلیتا، وہ اور اس کا ساتھی میرے پاس پہنچ چکے تھے۔

"کتنا دلچسپ اتفاق ہے۔" اینی بولی۔ اس کے لہجے میں کہیں بھی بناوٹ یا

تصنع کی جھلک نہیں تھی۔ اس ٹریجڈی پر اسے خفت نہیں بلکہ حقیقی مسرت ہو رہی تھی۔ چھوٹے ہوئے سانسوں کے درمیان دم لیتے ہوئے وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی ...... "سچ مچ آج کی شام بڑی خوبصورت ہے ! ...... ہے نا شیام؟"

اور جواب میں شیام نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ اینی کے لہجے میں ایسی شوخی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یکایک چونک کر بولی "ارے میں نے ابھی تک آپ دونوں کا تعارف بھی نہیں کرایا ! ...... یہ ہیں مسٹر رشید میرے بہت اچھے دوست ...... اور یہ ہیں شیام بمبئی کے بہت بڑے بزنس مین۔"

اس کے بعد ہم تینوں بہت دیر تک جوہو کی ٹھنڈی ریت پر ٹہلتے رہے۔ بہت سی باتیں ہوئیں میں نے اندازہ لگایا کہ شیام اور اینی ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔ بری طرح ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ شیام کو اپنی محبت پر پورا بھروسہ تھا۔ میری اور اینی کی بے تکلف باتوں پر اسے ذرا بھی برا نہ لگا۔ شاید وہ میرے بارے میں پہلے سے جانتا تھا! اسے میڈم کے متعلق بھی سب کچھ معلوم تھا ...... بہرحال وہ مجھے ایک سمجھدار، خوش اخلاق اور خوش مذاق انسان نظر آیا۔ جب واپس ہونے لگے تو اینی میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

"رشید صاحب۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے ...... میرے گھر۔ آپ سے ابھی اور باتیں کرنی ہیں۔"

"کیا ابھی چلنا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اسی وقت۔" اس نے جواب دیا۔

واپسی میں اینی میرے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی۔ شیام ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستے میں کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی جب موٹر سنٹرل ہاسپٹل پر رکی اور میں اور اینی اترنے لگے تو شیام پلٹ کر بولا۔

"سنو اینی۔ رشید صاحب سے آئندہ اتوار کا اپوائنٹمنٹ لے لینا۔ ڈنر کے بعد پکچر بھی دیکھی جائے گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔" اینی بولی۔

"اچھا بائی بائی۔"

"بائی بائی۔"

"بائی بائی مسٹر رشید۔" اور شیام چلا گیا۔

امیتی کے گھر میں پہلی دفعہ آیا تھا۔ مختصر سا کوارٹر تھا مشکل سے دو کمرے ہوں گے۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے اسے بہت تھوڑے لیکن عمدہ فرنیچر سے ڈرائینگ روم کے لئے آراستہ کیا گیا تھا۔ گھر میں ایک بوڑھی خادمہ تھی جسے بلا کر امیتی نے چائے کے لئے کہہ دیا۔

"شیام بابو مجھے خاصے اچھے آدمی معلوم ہوئے۔" خادمہ کے جانے کے بعد میں فوراً اصل موضوع پر آ گیا۔ امیتی بھی بظاہر یہی چاہتی تھی وہ کھڑکی پر پردہ درست کر رہی تھی۔ چونک کر میری طرف پلٹی۔

"اوہ! ...... شکریہ" اس نے کہا۔ "آج آپ سے اچانک ملاقات ہو جانا اچھا ہی ہوا۔ کتنی بار چاہا تھا کہ شیام کے بارے میں آپ کو بتاؤں۔ لیکن ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے بات ٹلتی گئی .... یا پھر شاید ایسے ہی کسی موقعہ کا انتظار تھا جو اتفاق سے آج ہاتھ آ گیا۔" وہ آکر میرے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ شیام کو کب سے جانتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی دو سال سے۔" وہ بولی۔ "وہ اور میرا بھائی کالج کے زمانے کے دوست ہیں۔ لیکن میں نے اسے پہلی بار اس دن دیکھا تھا جب وہ میرے بھائی سے ملنے یہاں گھر پر آیا تھا۔ میرا بھائی ایک عرصے سے کلکتہ میں مقیم ہے۔ وہاں اس کی ریڈیو کی دکان ہے ...... ان دنوں مجھ سے ملنے بمبئی آیا ہوا تھا۔" وہ دیوار پر اپنے بھائی کی تصویر دیکھتے ہوئے بولی۔ "پانچ سال بڑا ہے۔"

لیکن میں اس وقت اس کے بھائی کے بارے میں نہیں، شیام کے بارے میں سننا چاہتا تھا۔

"شیام بہت دولت مند گھرانے کا لڑکا ہے۔" آخر وہ بولی۔ "خود بھی لاکھوں کا

کاروبار کرتا ہے۔ شروع شروع میں مجھے اس کا روز روز یہاں آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کئی بار اسے منع بھی کیا۔ مگر نہیں مانا۔ بھائی واپس کلکتہ چلا گیا۔ لیکن وہ برابر مجھ سے ملنے آتا رہا۔
آخر ایک دن میں نے اسے اپنی اور مائیکل کی تمام کہانی سنا دی۔ میڈم کے متعلق بھی بتا دیا۔ میرا خیال تھا یہ سب سننے کے بعد وہ آنا چھوڑ دے گا...... لیکن...... لیکن....
...." وہ یکایک چپ ہو گئی۔

"اس نے شادی کی پیش کش کر دی.... یہی ہے نا؟" میں نے اس کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل یہی۔" اینی نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "وہ مجھ سے محبت کرنے لگا تھا...... شدید محبت! لیکن میں نے اس کی پیش کش ٹھکرا دی۔ اس وقت میرے دل میں اس کے لیے ایسے کوئی جذبات نہیں تھے...... یا پھر شاید وہ اتنے شدید نہ ہو سکے تھے۔ میں میڈم کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی...... میرے انکار کے باوجود شیام برابر آتا رہا۔ اس کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ پھر کبھی اس نے شادی یا محبت کا ذکر نہیں چھیڑا۔ اور پھر رفتہ رفتہ میں اس کے ساتھ گھومنے یا سنیما دیکھنے بھی جانے لگی، میں نے اسے زیادہ قریب سے دیکھا تو وہ ایک سمجھدار اور شریف آدمی لگا....
ہم آہستہ آہستہ دو بے تکلف دوستوں کی طرح ساتھ رہنے لگے!"

"کیا میڈم سے آپ کا ملتے رہنا شیام کو پسند تھا؟" میں نے درمیان میں پوچھا۔

"ہاں اس پر اس نے کبھی برا نہیں مانا۔ بلکہ کئی بار وہ خود مجھے ٹرین میں وہاں تک چھوڑنے جا چکا ہے!" اینی نے کہا۔

اور میں سوچنے لگا۔ شیام عام لوگوں سے کتنا مختلف ہے!......
اینی کہتی جا رہی تھی......

"اور پھر ایک دن میں نے اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔ اپنے مستقبل کے متعلق سوچا.... کیا میں ساری عمر اسی طرح اپنی ناکامیوں کا ماتم کرتے ہوئے گزار دوں گی؟...... کیا میں اکیلی زندگی کی ان تاریک راہوں سے گزر سکوں گی؟

اتنی بڑی آزمائش، اتنی سخت سزا آخر کس لئے! اُس دن مجھے محسوس ہوا۔ جیسے اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہی ہوں۔ وقت کے ساتھ انسان کے سوچنے اور سمجھنے کے دھارے بدل جاتے ہیں۔ مائیکل کے بعد پچھلے چار پانچ برسوں میں میرے اندر بھی کئی تبدیلیاں آگئی تھیں! ...... یہ ایک حقیقت ہے۔ بالکل ویسی ہی جیسی مائیکل کی محبت ایک حقیقت تھی! نہ یہ جھوٹ ہے، نہ وہ جھوٹ تھا!"

"اور پھر آپ نے شیام سے شادی کا وعدہ کرلیا؟" میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔

جواب دینے کی بجائے امینی مجھے چپ چاپ گھورنے لگی۔ اس وقت اس کے چہرے سے کسی قسم کا تاثر، کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ جیسے وہ رنج و مسرت، سکون و اضطراب کے دوراہے پر کھڑی ہو! بالآخر آہستہ سے بولی۔

"شیام سے ابھی میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ اس نے اب ہر چیز ہر فیصلہ، ہر موڑ، میری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ ایسا اس نے کبھی زبان سے نہیں کہا۔ لیکن میں جانتی ہوں۔"

"تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"رشید صاحب۔ کیا آپ سمجھتے ہیں اگر میں شادی کرلوں تو میڈم زندہ رہے گی! امینی تقریباً چیخ کر بولی۔ وہ اضطراری طور پر کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ "نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ میں میڈم کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ مرجائے گی ...... میرے بغیر زندہ نہ رہ سکے گی! ...... میں جانتی ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں اُسے ذرا سا بھی دکھ نہیں پہنچا سکتی! اور ...... اور نہ میں شیام کو چھوڑ سکتی ہوں۔ میں اس کی محبت کی راہ میں بہت دور نکل چکی ہوں ...... مجھے اس کا احساس ہے! میں اس کے سہارے مستقبل کے خوبصورت محل کھڑے کرچکی ہوں۔ میں نے پھر ایک بار جینے کی کوشش کی ہے۔ اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق جمع کئے ہیں۔ اگر اب بکھر گئے تو پھر کبھی یکجا نہ ہوسکیں گے! کبھی نہیں! ...... اوہ میں کیا کروں! ...... رشید صاحب؟ ...... بتایئے میں کیا کروں!" وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کا سانس

بھول گیا تھا۔ اور ہاتھوں کی مٹھیاں بار بار کھلتی اور بند ہوتی جا رہی تھیں .....

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں! اس کی زندگی کا یہ رخ میرے لئے نیا تھا اور اس کے بارے میں اتنی جلدی بھلا کیا سوچ سکتا تھا' میں خاموش رہا۔ اینی بھی اب خاموش تھی ...... تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی اپنی کرسی پر جاکر بیٹھ گئی۔

مجھے یاد ہے اس رات اپنے کمرے میں واپس آ کر بہت دیر تک میں سو نہیں سکا تھا۔ اینی کا وہ سوال بار بار ذہن میں نشتر سے چبھوتا رہا .... "اب کیا کروں؟ رشید صاحب، بتلائیے اب میں کیا کروں؟ ....

اینی کیا کرے؟ ...... اس کا جواب نہ مجھے معلوم تھا اور نہ خود اینی کو۔

حالات ویسے ہی رہے۔ دن گزرتے گئے۔ میں اینی اور میڈم سے برابر ملتا رہا۔ میڈم کے ساتھ اینی کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا .... وہی خلوص تھا' وہی محبت تھی! کون کہہ سکتا تھا کہ یہ سب کچھ محض رحم کی بنیادوں پر قائم ہے! ...... اس دوران میں شیام سے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ اینی کے یہاں وہ پابندی سے آتا رہا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میں ہمیشہ یہی سوچتا کیا سچ مچ انہوں نے اب تک شادی نہیں کی؟

اور پھر یہ ہوا کہ کچھ دنوں تک میں کسی سے نہیں مل سکا۔ میں اپنے کاموں میں الجھا رہا اینی یا میڈم کی کوئی خبر مجھے نہ مل سکی بالآخر ایک دن شام کو گھر پہنچا تو اینی کا خط پڑا ہوا ملا۔ اس نے صرف دو جملے لکھ بھیجے تھے۔ "جمعہ کی صبح کو میں اور شیام شادی کر رہے ہیں۔ ٹھیک دس بجے میرے یہاں پہنچ جانا۔"

مجھے یوں لگا جیسے یہ آتش فشاں جو اب تک اپنے اندر تمام شعلوں کو چھپائے خاموش کھڑا تھا' اب پھٹ پڑے گا۔ وہ موڑ' وہ نقطہ آ پہنچا ہے جو حالات کے اس تعطل کو ختم کر دے گا! ...... اس کا آنا لازمی تھا۔ اس اہم فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے اینی کو کس ذہنی کشمکش روحانی اذیت سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اس کا مجھے اندازہ تھا ......

ان دو جملوں کے پیچھے کتنے طوفان' کتنے اندیشے اور کتنے ولولے پوشیدہ تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک سوال گھوم رہا تھا ...... میڈم کا کیا ہوگا؟ اینی نے

میڈم کے متعلق کیا سوچا ہے؟...... کیا جن ہاتھوں سے اس نے میڈم کو نئی زندگی بخشی تھی، انہی ہاتھوں سے وہ اس کا گلا گھونٹ دے گی۔؟

خط مجھے جمعرات کی شام کو ملا تھا۔ رات بھر میں یہی سوچتا رہا...... بے میڈم کا کیا ہوگا۔

دوسرے دن ٹھیک دس بجے میں امینی کے یہاں پہنچ گیا۔ شیام آچکا تھا۔ اس کے چہرے سے کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح خاموش اور مطمئن سا بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر میں امینی بھی اندر سے تیار ہو کر آگئی۔ حسب معمول معمولی سا میک اپ تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ شادی کے لئے گھر سے نکلے ہیں!...... اور پھر ہم تینوں شیام کی کار میں سول میرج کے دفتر روانہ ہو گئے، شادی وہیں ہونی طے پائی تھی۔

امینی آج بھی میرے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ شیام ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہاں کار میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا۔ جیسے امینی کچھ گھبرا سی گئی ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم ہم آنے والے واقعہ کے تصور میں کھوئی ہوئی بیٹھی تھی۔ آج اس کے چہرے پر ایک دفعہ بھی مسکراہٹ کے حسین نقش اُبھر نہ سکے! راستے میں اس سے میں نے صرف اتنا پوچھا——

"میڈم کے بارے میں کیا سوچا ہے۔؟"

اور اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "سوچ لیا ہے۔"

شائد وہ بتانا نہیں چاہتی تھی یا پھر شائد اب تک خود اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے! میں نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔

میرج آفس پر شیام کے دو تین بے تکلف دوست اور امینی کی ایک سہیلی منتظر کھڑے تھے۔ شادی کے مراحل طے پانے تک گیارہ بج گئے۔ آفس سے نکلتے وقت امینی نسبتاً پر سکون نظر آرہی تھی۔ وہاں سے نکل کر ہم سب تاج ہوٹل پہنچے جہاں شیام نے ایک پارٹی کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہاں کچھ اور دوست احباب بھی مدعو تھے۔ پارٹی کے دوران ہلکے ہلکے قہقہوں اور لطیفوں نے سنجیدگی کا احساس کسی قدر کم کر دیا جو اتنی

دیس سے ذہنوں پر مسلط تھا۔ اینی آہستہ آہستہ نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ پارٹی کے بعد ٹھیک ایک بجے ہم سب اینی اور شیام کو خدا حافظ کہنے وکٹوریہ ٹرمینس پہنچے وہ دونوں ہنی مون کے لئے کھنڈالہ جا رہے تھے۔ ریل کے چلتے وقت اینی نے مجھے قریب بلا کر آہستہ سے کہا.....

"گھبرائیے نہیں۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔"

لیکن جس وقت میں ویسٹرن ریلوے کی لوکل میں واپس اپنے کمرے کو جا رہا تھا، تو راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ آخر اینی نے کیا سوچا ہے!

کیا اب بھی وہ میڈم سے ملنے آیا کرے گی۔؟

میڈم کے فلیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدم ایک لمحے کے لئے خود بخود رک گئے۔ دروازے پر پردہ پڑا تھا اور اندر ہمیشہ کی طرح خاموشی تھی۔ میں پردے میں سے اندر جھانکے بغیر نہ رہ سکا ...... میڈم ایک صوفے پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی تھی!...

پیچھے دیوار پر مائیکل کی تصویر آویزاں تھی۔ وہی بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ لئے ہوئے!

...... اور پھر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دوسرا دن کسی واقعے کے بغیر گزر گیا۔ دن بھر اپنے کاموں کے سلسلے میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔ رات کو تھک کر جلد ہی سو گیا۔ تیسرے دن اتوار تھا۔ دیر تک سوتا رہا۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ کیا اور باہر نکلنے کے ارادے سے کمرہ بند کر رہا تھا کہ جان آتا ہوا دکھائی دیا۔ معلوم نہیں کیوں اسے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

"میڈم نے کہا ہے اگر فرصت ہو تو تشریف لائیے" وہ قریب آکر بولا۔

"کیا وہ اکیلی ہیں؟" شاید میری آواز کانپ رہی تھی۔

"نہیں مس اینی بھی آئی ہیں۔"

ایک ہلکی سی سرد لہر سر سے پیر تک دوڑ گئی۔ چند لمحے وہیں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ جیسے پاؤں زمین سے چپک کر رہ گئے ہیں! کوئی میرے کانوں میں بار بار دہرا رہا تھا۔ "اینی آئی ہے...... اینی میڈم سے ملنے آئی ہے!" اور پھر میں چونک پڑا' جان مجھے عجیب سی نظروں سے تک رہا تھا۔ میں فوراً اس کے ساتھ روانہ ہو گیا اینی آئی ہے

تو اس میں میرے اتنے پریشان ہونے کی کونسی بات ہے!، میں سوچنے لگا۔

لیکن پھر بھی میڈم کے فلیٹ میں داخل ہوتے وقت میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میڈم کے یہاں ہر چیز حسب معمول تھی۔ کہیں بھی کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اینی اور وہ میز پر جھکے ہوئے کسی میگزین میں تصویریں دیکھ رہے تھے۔ اینی کے چہرے سے کوئی خاص بات نمایاں نہیں تھی اس کے کپڑے، بالوں کی سجاوٹ، اس کا سراپا...... سب کچھ ویسا ہی تھا، جو ہمیشہ ہوا کرتا تھا! ہونٹوں کے کناروں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی ویسی دلکش، ویسی معصوم تھی! کہیں بھی، کوئی ذرا سا بھی "تغیر" ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ میڈم کی آنکھوں میں بھی وہی پیار، وہی خلوص تھا جو ہمیشہ اینی کی موجودگی میں پیدا ہو جاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرا دی۔ اور اینی ہمیشہ کی طرح چہک کر بولی۔ "ہلو رشید صاحب!"

اور اب ہر بات میری سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔ ذہن پر سے وہ سارا بار، اعصابی تناؤ اترتا جا رہا تھا جو آتنی دیر سے مسلط تھا۔ مجھے ایک گونہ سکون محسوس ہوا۔!

میڈم کے فلیٹ میں آج بھی ہر چیز ویسی ہی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا! اب یہاں کی کوئی چیز نہیں بدلے گی۔ یہ ماحول، یہ کمرہ، یہ دن، یہ راتیں، میڈم، اور میڈم کی بیماری، ننھی سی بچی اینی یہ سب ویسے ہی رہیں گے۔ اس کے کمرے کے اندر نہ تو وقت آگے بڑھے گا ______ اور نہ زمانہ فاصلے طے کریگا۔ باہر سینکڑوں تغیرات ہوں گے۔ نئے نئے واقعات اور حادثات رونما ہوں گے، دنیا آگے بڑھے گی اور زندگی منازل طے کرے گی۔ لیکن یہاں کچھ نہ ہوگا! وقت یہاں کسی میز کے نیچے دبک کر سویا پڑا رہے گا ...... میڈم وہی رہے گی۔ اینی وہی رہے گی اس نے کہا تھا نا...... "میں نے سوچ لیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔؟"

اور پھر ہم لوگ برج کھیلنے لگے۔ چائے آئی۔ باتیں ہوئیں۔ وقت اسی طرح گزر گیا جیسے پہلے ہمیشہ گزرا کرتا تھا۔ میڈم خوش تھی اینی خوش تھی اور جب میں جانے لگا تو اینی خدا حافظ کہنے دروازے تک بھی آئی۔ اسکی مسکراہٹ آج ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

"آج رات میں یہیں میڈم کے ساتھ رہوں گی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ ▲▲

نجات کا لمحہ

ایک نئی استغنائی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیئے جب وہ گھر آیا تو سب اسے مسرور دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ لوگ اسے دیکھ کر ہمیشہ حیران کیوں ہو جاتے ہیں!

اس دن اس نے ٹھیک سے کھانا کھایا۔ ڈھنگ سے کپڑے پہنے۔ اور گنگناتا ہوا باہر نکل گیا۔ مگر باہر ...... وہی ویران بستی، بے جان لوگ، بے نظر آنکھیں! اداس سناٹا اس سے سرگوشی کرنے لگا۔

____ بتاؤں گا، ...... بتاؤں گا تمہیں بھی اپنی مسکراہٹ کا راز، پھر کوئی مشکل نہیں رہے گی۔ میں نے گھنٹیوں کی آواز سن لی ہے، دور سے ہی سہی! ذرا ایک ڈنڈی پر ہو تو لوں ...... تم سے کہوں گا۔

پہلے تین دن بڑی تیزی سے گذر گئے۔ جب سے جوتشی نے بتایا تھا، ٹھیک ساتویں دن وہ اس دنیا میں نہیں رہے گا، اس کے دماغ کا سارا ہیجان یک لخت ختم ہو گیا۔ اس نے منزل کو پا لیا تھا۔ انتظار اور بے یقینی کا اضطراب بالآخر ختم ہونے والا تھا! ..... جوتشی کے الفاظ امرت کے قطرے بن کر اس کے کانوں میں اتر رہے تھے۔ ساتواں دن اس کی نجات کا دن ہوگا!

بہت سے کام جو ادھورے پڑے تھے، اس نے پورے کر لئے۔ جن سے کترا کر نکل جاتا تھا، جا جا کر خود ملتا رہا۔ اچانک ان نوازشوں پر دوست، دشمن سب حیران رہ گئے۔ اتنا خوش کیوں ہے؟ ...... پھر وہی حیرانی! ... کل تک تو کال بیل بجتی تو خوف سے چادر تان لیتا تھا!

—— بے وقوفو - آج حیرانی مجھے ہو رہی ہے - کب تک ویران بستیوں کی نکیلی سڑکوں پر اپنے لہو کھلے جسموں کو گھسیٹتے رہو گے؟ سناٹے کی آواز کیوں نہیں سنتے؟

دُور گھنٹی کی آواز ....

مگر پھر یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ اس کی خوشی، جیسے مقدس راز بنا کر اس نے اپنے اندر تہوں میں لپیٹ رکھا تھا، بے اطمینانی میں بدلنے لگی - وہ استغنائی مسکراہٹ کہیں تحلیل ہوتی گئی۔

شروع کے تین دن، جب بھی گھر میں ہوتا، بان کی چارپائی پہ چادر تان کر آرام سے لیٹ جاتا.... دن ہو یا رات - اور لمحوں کے گذرنے کو محسوس کرتا - ہر لمحے کو کچھ دیر کے لئے اپنی گرفت میں رکھتا - اس کے وجود کو محسوس کر کے آزاد کر دیتا - اس میں اسے ایک مسرت ملتی۔

—— کچھ ہی دنوں میں تم مجھے نہ پا سکو گے، مجھے چھو کر نہ جا سکو گے - میں تمہارے کرب سے آزاد ہو جاؤں گا - وہ کرب میں تمہیں دے جاؤں گا ——

مگر اب —— چوتھے دن سے چارپائی پر لیٹا تو کسی ان دیکھے خوف نے اسے گرفت میں لے لیا - یہ ایک نیا تجربہ تھا - دل کے کسی کونے میں خواہش پیدا ہوئی کہ ...... لمحات کا پہیہ آہستہ گھومے - وقت کا سیل دھیما پڑ جائے۔

— کیوں؟ .... ایسا کیوں ہوا؟ ..... کیا یہ ڈر ہے؟ ..... آنے والے ساتویں دن کا ڈر؟ ...... یہ دبا دبا اضطراب - دل بیٹھا جا رہا ہے! وہ سرور آگیں کیفیت کہاں گئی؟ ..... پنجرے کا دروازہ تو کھلنے والا ہے!۔

خوف بڑھتا گیا۔ صبح ہوتی تو چادر سر پر کھینچ لیتا کہ نیا دن اتنی جلدی نہ آ جائے۔ شام ہوتی تو اندھیرے کو دونوں ہاتھوں سے روکتا، ..... پرے دھکیلتا - پر کچھ نہ ہوتا۔ رات چھت سے اتر کر آنگن میں آ جاتی اور ہول کے بر فیلے ہاتھ پھیلا دیتی۔

یہ کیسا ہول ہے! ..... عجیب، اجنبی سا ڈر! جو بڑھتا ہی جا رہا ہے - ہر پل ہتھوڑے کی ضرب کا وقفہ کم ہوتا جا رہا ہے - اور دل کنویں میں اترتا جا رہا ہے۔

ڈر تو اس کے اندر پہلے بھی گھر کر چکا تھا، جو تشی سے ملنے سے پہلے ہی ..... کیا وہ واہمہ تھا؟ ..... وہ سوچنے لگا - کیا لوگ میرے بارے میں سچ کہتے تھے؟

بے وقوف۔ ایسا ہوتا تو جوتشی کی پیشین گوئی سے جو خوشی کی لہر رگ رگ میں اترتی چلی گئی، وہ سچ نہوتی۔ مگر وہ تو سچ تھی۔ بالکل سچ! ..... رہائی .... رہائی ..... پنجرہ کھل جائے گا!

تو کیا نجات کی گھنٹیوں کی وہ آواز ..... واہمہ تھی؟ ..... جسکی تلاش تھی، جلتے ہوئے ریگ زاروں میں وہ پگ ڈنڈی .... محض سراب تھی؟ اس نے تو مسرتوں کو اپنے اندر بھینچ کر چھپا لیا تھا ..... ندیدے بچے کو کھلونا مل جائے تو سب کی نظر بچاکر کرتے کے اندر چھپا لیتا ہے۔ مگر اب کرتے کے اندر برفیلا خوف ہے۔ کیا سرد اندھیرے کا سامنا .... سب کو خوف زدہ کر دیتا ہے؟ ..... اس کا دماغ دکھنے لگا۔

شروع کے دنوں میں پلنگ پر لیٹتا تو گھر والوں کا خیال گھیر لیتا ——— بیوی، بچے .... بھائی .... رشتہ دار .... اور وہ زیر لب مسکراتا رہتا .... کون رشتہ دار؟ .... کون بیوی، کیسے بچے؟ .... سب ایک اکائی میں گندھے ہیں .... میں، نقطہ میں خود سے بچھڑ گیا ہوں۔ وہ سوچتا۔ مگر اب ..... تلاش کی منزل آگئی ہے۔

مگر چھ تھے دن سے منزل کے قرب کے اس احساس نے ایک نئے، اجنبی ہول سے ہم کنار کر دیا۔ دل پر ایک برف کی سل رکھ دی۔

اور پھر یہ برفیلا خوف بڑھتا ہی گیا۔ ہذیانی روپ دھار لیا اس نے۔ دن اور وقت کا حساب بھی بس سے باہر ہو گیا۔

پانچواں دن ..... یا شاید چھٹا دن ہے .... اسے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ عجیب بے ہنگم آوازیں کانوں میں آرہی ہیں۔

"دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ان کو کیا ہو گیا ہے!"

"ڈاکٹر کو کیوں نہیں بتاتے؟"

وہ چیخ پڑتا ——— نہیں۔ ڈاکٹر نہیں آئے گا۔ کچھ نہیں ہوا ہے مجھے ..... ہونے والا ہے۔ مگر تم نہیں سمجھوگے ..... بے وقوفو۔ خود غرضو ....!

——— اور اس کا حلق سوکھ جاتا۔ کانٹے چبھنے لگتے۔

"زبان میں بڑبڑا رہے ہیں۔"

کانوں میں رونے کی آوازیں آرہی ہیں..... بناوٹی۔ سب بناوٹی!

اور اب یکایک اسے لگا وہ صاف دیکھ رہا ہے۔ صاف سن رہا ہے ــــ!

ــــ یہ جو وہ پندرہ برس کا لڑکا..... یہ تو میں ہوں۔ میں خود ہوں۔

حویلی میں ہر طرف عورتوں اور بچوں کی بھیڑ ہے، زرق برق لباس ہیں!..... ہاں شادی ہو رہی ہے ــــ

باہر نوہرے میں بیلوں کو بانس کی نلکی سے گھی پلایا جا رہا ہے۔ سینگوں پر مالش کی جا رہی ہے۔ رنگ پھیرے جا رہے ہیں۔ رتھیں، بہلیاں، سب جمع ہیں..... نیچے اینٹوں کے فرش پر۔ بارات جائے گی'..... جیور، جمنا پار۔

یہ رتھ ٹھاکر دل نے بھجوائی ہے۔ وہ دلہن کی رتھ، سندر لال بزاز نے سجا کر بھیجی ہے۔ اور قاضیوں نے ــــ میوڑوں نے.....

اور پھر یکایک پردہ جھکڑ میں گڑبڑ ہو گئی۔ فلم کے کئی فریم تیزی سے اوپر نیچے دوڑنے لگے۔ کچھ سجھائی نہ دیا.....

مگر جلد ہی سب ٹھیک ہو گیا۔ اب جیور سے دلہن بیاہ کر ماموں جان واپس پلول جا رہے ہیں.....

بارات واپس ہو رہی ہے۔ جیور سے نکلتے ہی جمنا کو رتھوں اور بیل گاڑیوں نے آسانی سے پار کر لیا۔ اور اب کھادر کے جنگل میں سے گذر رہے ہیں۔..... سرکنڈوں کے گنجان جھنڈوں میں سے۔ یہاں جنگلی سور بہت ہیں، اباجی نے بتایا تھا اسے۔ اور بہلی میں بیٹھے بیٹھے اسے ڈر لگنے لگا۔ سوروں کا ریوڑ آکر بہلی گرا دے گا۔ اس پر حملہ کر دے گا..... وہ بھیا سے لپٹ گیا ہے۔

"لِٹا دو۔ لِٹا دو..... دورے کی حالت ہے۔"

ــــ دُور سے'..... بہت دُور سے آواز آرہی ہے۔ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی.....

مگر اب ڈھاک کے ہرے بھرے جنگل میں سے گذر رہے ہیں۔ اس کی بہلی اور ایک دوسری بہلی میں دوڑ ٹھن گئی ہے..... تیز اور تیز..... بیل دوڑ رہے ہیں اور وہ سن رہا ہے، کوئی پیچھے سے چیخے جا رہا ہے..... بہلی کا پہیہ الگ ہو گیا ہے!" اور اس نے دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے۔ دایاں پہیہ گاڑی سے الگ ہو کر اسی رفتار سے لڑھکتا چلا آ رہا ہے.....

اور پھر ایک ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئیں، بہلی الٹ گئی۔ وہ، اور بھیا، اور سب لوگ جانے کہاں کہاں اور کیسے کیسے گرے۔ گرتے وقت وہ چیخ پڑا ـــــ خوف کے کھیس میں لپٹی ہوئی چیخ.......

"ہائے اللہ..... آج تو حالت بگڑتی ہی جا رہی ہے!" ـــــ شہد کی مکھیاں پھر بھن بھنائیں۔

ـــــ اور اب بارات جھجھو نگر کی نہر کے پاس سے گذر رہی ہے۔ چھال پرامی اور دوسری کئی عورتیں رتھوں سے اتر کر امرود اور بیریوں کی جھاڑیوں میں گھس گئی ہیں۔ بیر اور امرود توڑ توڑ کر کھا رہی ہیں۔ امی کتنی اچھی لگ رہی ہیں، جوان اور خوب صورت۔ لال لال بیروں سے پرات بھر لی ہے...... جھجھو نگر کی نہر پر لمبے گھنے اور پرانے پیڑ ہیں...... ان کی جڑیں زمین کے اوپر تک نکل آئی ہیں.... ان کے سائے میں کیسی ٹھنڈک ہے!

برات پلول پہنچی تو بانکے جوانوں نے ہوا میں بندوقیں چلائیں، اور گز بھرے....... قاضی، ٹھاکر، میو، بامن، گورے، گوجر، جاٹ....... مرد، عورتیں اور بچے....... اور باجہ،.... پٹے بازی..... شور و غل۔ کان پھٹے جا رہے ہیں۔ کسی نے بالکل اس کے کان کے پاس بندوق چھوڑی..... وہ اچھل کر چیخ پڑا۔

"مولا خیر!.... اب یہ بچیں گے نہیں۔"

گرم سانسوں اور ہچکیوں میں شور و غل کا آہنگ ٹوٹتا سا لگا،......

جیسے رنگ ایک دوسرے میں پھیل گئے ہیں۔ مل گجے آسمان پر سنہری کرنوں کے بیچ زرد گدلے تالاب ابھرنے لگے ......

—— لیکن سارے پرند اڑ گئے تھے۔ بندوق کی آواز کے ساتھ ہی گھنے درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں میں جو چھپے بیٹھے تھے ..... طوطے، ہریل، گلسر، ٹوٹرو، ہدہد اور نیل کنٹھ، ..... اور فاختائیں۔ سب ہی اڑ گئے تھے۔ اور وہ بہت دیر تک ان کی قطاریں آسمان میں دیکھتا رہا .... اور پھر وہ زرد دَل دَل میں غائب ہوتے گئے۔

اور پھر ایک بڑے دھماکے کے ساتھ وہ قدآور پیڑ گر گیا۔ جڑیں زمین کے باہر منہ اٹھائے چت پڑی تھیں ——

اتنا پرانا اور گھنا درخت کیسے گر گیا! وہ اسے بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ ..... اور وہ یوں بے جان ہو کر اس کی بے بس نظروں کے سامنے گر گیا! ..... وہ بے چین ہو کر چیخنے لگا —— اسے گرنے مت دو ..... اس کے پرندوں کو واپس بلا لو۔ سنتے نہیں ہو؟ .... بزدلو، .... بے وقوفو؟۔

اس کی چیخوں میں چھتے والی مکھیوں کی بھن بھناہٹ بھی ابھرتی رہی، ہچکیاں اور دبیز سانسوں کی آوازیں بھی۔

—— پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوش پڑا رہا .... جانے کب تک۔

جب ہوش آیا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میز پر کیلنڈر دیکھا .....

ساتواں دن! .... آخری دن .... نجات کا دن؟

تم بچ نہیں سکتے۔ اُس کا کہا ہوا کبھی غلط نہیں ہوا —— اس کے دوست نے کہا تھا۔

وہ یکایک اٹھ کر کھڑا ہو گیا .... ابھی کھڑا ہو سکتا تھا! اس نے حیرانی سے اپنے آپ کو دیکھا۔

دروازے سے باہر نکل گیا .... ابھی چل سکتا تھا!

اور پھر اُدھڑی ہوئی سڑک پر دوڑنے لگا .... ابھی دوڑ بھی سکتا تھا!

—— بھاگ جا ..... بھاگ جا .....

—— کہاں جارہا ہے؟ ..... کیا بھاگ کر جاسکتا ہے؟ ہر طرف ننگی تلواریں لٹک رہی ہیں'..... اور دل پر برف کی بھاری سل ہے۔

یکایک اس کے قدم رک گئے .... اُدھڑی ہوئی سڑک اس کے پیروں سے چمٹ گئی۔ سامنے سے ارتھی آرہی تھی۔ تھوڑے سے آدمی، کھوئے کھوئے سے'..... گردن جھکائے پیچھے پیچھے آرہے تھے ...... رام نام ست ہے۔

وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ سرد نکیلی لہر اوپر سے نیچے تک چیرتی چلی گئی

—— رام نام ستیہ ہے۔

اور پھر سرد پسینہ۔ سارے جسم پر برف کے قطرے چیونٹوں کی طرح رینگنے لگے ......

—— مگر یہہ کیسے ہوسکتا ہے ... میں تو یہاں کھڑا ہوں!؟

—— بے وقوف؟ لوگ تجھے دیکھ بھی رہے ہیں۔ تو نظر آرہا ہے۔ .... تیری گھگھی کیوں بندھ گئی ہے؟

"کون ..... کون مرگیا ہے؟ ..... آج تو مرنے والا ....."

"تم جانتے تھے اسے؟ ——"

جواب کا انتظار کئے بغیر وہ آگے بڑھ گئے۔ اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا، درخت کے نیچے۔

یک لخت کسی شاخ پر سے ایک بڑا سا پرندہ پھڑپھڑا کر اڑ گیا ...... ہر طرف موجوں کا ہیجان بکھیر کر۔

اور ان موجوں میں برف کے رینگنے والے قطرے اس کے جسم پر تحلیل ہونے لگے۔ وہ سائے میں لیٹ گیا۔ شاخوں کے جھرنکوں میں سے اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

وہاں گدلی زرد دَل دَل مسکرا رہی تھی۔ ▲▲

نیم کا پیڑ

باہر گلی میں کتے بہت زور زور سے بھونک رہے تھے جس سے بنسی کی آنکھ کھل گئی۔ دل ہی دل میں ان کو بُرا بھلا کہتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی تو بانس کی پرانی چار پائی چرچرا اٹھی۔ لیٹے لیٹے ٹانگوں سے کھلی بانوں پر کھیس کو اچھی طرح پھیلا کر وہ پھر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر رات کے گہرے سناٹے میں کتوں کی چیخیں کانوں میں چبھی جا رہی تھیں۔ کہیں دور چوکیدار چلّا رہا تھا ——— ہوشیار، خبردار، اور پھر اپریل کی سلگتی ہوئی رات! اوپر نیم کی شاخیں سر نیوڑھائے چپ چاپ کھڑی تھیں۔ کہیں ایک پتہ بھی ہلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بنسی کو وحشت سی ہونے لگی۔ آنکھیں کھول کر وہ نیم کی شاخوں کے جال میں سے ستاروں کو دیکھنے لگا..... دو یا ڈھائی بجے ہوں گے، اس نے اندازہ لگایا۔

چوکیدار کی آواز اب قریب آ گئی تھی۔ گلی میں اینٹوں کے فرش پر اس کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک کتوں کی چیخوں کے ساتھ اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ چار پائی پر لیٹے لیٹے گردن کو ذرا سا موڑ کر اس نے آہستہ سے پکارا۔

"منگلو..... منگلو رے! اٹھ بیٹھ ذرا" ——— اور پاس ہی اندھیرے میں ایک اور چار پائی چرچرائی۔

"کیا ہے بابو؟" منگلو، بنسی کا بیٹا نیند بھری آواز میں بڑبڑایا۔

"کتے بڑی دیر سے بھونک رہے ہیں۔ جانے کیا بات ہے.... ذرا ہوشیار رہیو"

"کچھ نہیں بابو" بھلا یہاں کون چور آ سکتا ہے!...... یہ کتے حرامزادے

تو روز ہی چلاتے ہیں" اور کروٹ بدل کر منگلو پھر سو گیا۔

بنسی چپ ہو گیا۔ ٹھاکر روپ سنگھ کی حویلی میں سچ مچ آج تک کسی جیالے کو چوری کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں چوروں کا آنا جانا دن رات لگا رہتا تھا۔ مگر وہ آتے تھے صلاح مشورے کرنے۔ چوریوں کی نئی نئی اسکیمیں بنانے۔ یا پھر چرائے ہوئے مال کا بٹوارہ کرنے۔ ٹھاکر صاحب ان کے سرغنہ تھے۔ بڑے بڑے نامی چور اور ڈاکو ان کے اشارے پر چلتے اور ان کے بتائے ہوئے طریقوں سے دُور دُور تک چھاپے مارتے۔ سینکڑوں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے۔ سارا علاقہ ٹھاکر صاحب کے نام سے کانپتا تھا۔ مائیں اپنے بچوں کو ڈراتے کے لئے ان کا نام لیا کرتی تھیں ——— مگر یہ سب بیتے دنوں کی باتیں تھیں۔ اب وہ بات جاتی رہی تھی۔ بنسی کے دیکھتے دیکھتے ٹھاکر صاحب کا سارا رعب داب، ساری آن بان ختم ہو گئی تھی۔ اب نہ ان کا وہ کاروبار باقی رہا تھا، اور نہ وہ پہلی سی آمدنی، اور نہ وہ پہلی سی دن رات کی محفل آرائیاں! اب تو ان کی تجوری تک قصبے کے کسی بھی منچلے نوجوان کا ہاتھ باآسانی پہنچ سکتا تھا۔

حویلی کے پچھواڑے صحن سے ملا ہوا ٹھاکر صاحب کا نوہرہ تھا۔ جہاں ان کے مویشی بندھتے تھے۔ اور قصبے کے سب سے بڑے رئیس ہونے کے ناتے ان کے یہاں مویشی بھی سب سے زیادہ تھے۔ رات کو جب وہ برابر برابر کھونٹوں سے بندھتے تو نوہرہ کا وسیع احاطہ ان سے بھر جاتا۔ ایک طرف کونے میں ڈربوں کے اندر مرغیاں اور بطخیں بند ہوتی تھیں۔ ان کے آگے بکریاں اور بھیڑیں باندھی جاتیں۔ اور ان کے بعد دیوار سے ملی ہوئی الاونڈیوں کے مقابل بھینسیں، گائیں اور بیل ہوتے تھے۔ وسیع احاطے کے درمیان نیم کے پیڑ کے ساتھ ایک لالٹین لٹکا دی جاتی جس کی میلی میلی روشنی سیاہ راتوں میں کوئی کام نہ دے سکتی۔

بنسی کا کام مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اس کی ساری عمر بیلوں اور بھینسوں کو کھریرہ کرتے یا ان کو کھلے بانس میں گڑ اور تیل پلاتے گذری تھی...... رات کو وہ سوتا بھی ان ہی کے پاس تھا کسی زمانے میں اس کے برابر اس کے باپ کی چارپائی ہوتی تھی۔ مگر اب وہاں اس کا بیٹا منگلو سوتا تھا۔ وہ تو اب ٹھاکر کے مویشیوں کی تعداد

گھٹ گئی تھی۔ ورنہ بنسی کے بچپن میں ان کے درمیان رات کو دو چار پائیوں کی جگہ نکلنا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔

بنسی کو جب یقین ہو گیا کہ اب دیر تک نیند نہ آسکے گی تو اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکیدار کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک اور کتوں کی چیخ پکار رات کی پُراسرار تاریکیوں میں جذب ہو چکی تھی۔ اور اب ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف کبھی کبھی نیم کے پرے سے چوپایوں کے جگالی کرنے کی آوازیں سُنائی دے جاتی تھیں۔ جیسے کوئی سروتے سے چھالیہ کتر رہا ہو۔

آہستہ آہستہ قدم دھرتا بنسی مویشیوں کے پاس چلا آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک جاتے۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگتے، اور پھر جگالی میں مصروف ہو جاتے، ان کے آگے دھری ہوئی ناندیں اور پرانتیں چارے سے خالی ہو چکی تھیں۔ پھر بھی گوبر اور مینگنیوں کی مخصوص بو کے ساتھ ساتھ نوہرے میں ابھی تک کھلی اور بھوسے کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ چھپر تلے بنسی کے چہیتے اور قیمتی بیلوں کی جوڑی بندھی تھی۔ جانے پہچانے قدموں کی چاپ سن کر وہ دونوں بدن جھٹک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور خالی الاونڈی میں منہ سے "فوں فوں" کر کے بھروسہ اڑانے لگے۔ بنسی نے بڑے پیار سے انہیں تھپتھپایا...

...... یہ چوپائے اس کی زندگی تھے اور چاؤ سے وہ انہیں اسی طرح تھپتھپاتا جس طرح کسی زمانے میں وہ منگلو کو تھپک تھپک کر سلایا کرتا تھا۔

واپس اپنی چارپائی پر جانے کی بجائے بنسی حویلی کے صحن کی طرف نکل گیا۔ حویلی کا لمبا چوڑا صحن رات کی تاریکی میں اور بھی زیادہ وسیع معلوم ہو رہا تھا۔ بائیں طرف دالان کے بازو دو منزلہ کوٹھا تھا جو زنان خانہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مگر گرمیوں میں سب لوگ اوپر چوبارے پر سوتے تھے۔ کوٹھے کے آگے پختہ دالان کے سرے پر ایک خوبصورت سی بارہ دری تھی۔ جو ٹھاکر صاحب کی بیٹھک کے نام سے مشہور تھی۔ اس کا اصل دروازہ باہر گلی کے فرش پر کھلتا تھا۔ ٹھاکر صاحب کی پچاس سالہ زندگی کے بیشتر لمحات اسی بیٹھک میں گزرے تھے۔ اور اس کے ساتھ بڑی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ بیٹھک میں ہمیشہ

ٹھاکر کے یار دوستوں اور مہمانوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا۔ شب و روز ہنگامہ آرائیاں رہتیں۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گذرتا، جب کم از کم دو چار یار دوست ان کے مہمان نہ ہوتے! ......

ٹھاکر کے اچھے دن گذر چکے تھے۔ لیکن ہاتھی مرا بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ جوانی کے دوسرے شوق پھیکے پڑ جانے پر بھی شراب اور جوّے میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ پہلے جہاں بدیشی شرابوں کے ساغر کھنکتے تھے۔ اب وہاں دیسی اور سستی شراب کے دَور چلتے تھے اور جوے میں جہاں ایک ایک رات میں ہزاروں کے اُلٹ پھیر ہو جاتے تھے اب وہاں سو دو سو کے آگے بات نہیں بڑھتی تھی، جوّا ٹھاکر کی گھٹّی میں پڑا تھا۔ ان کے خون کے ساتھ جسم کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس کے بغیر ان کا ایک دن بھی کٹنا محال تھا۔ پُرانے ساتھی اب ان کے یہاں آتے سے کتراتے تو وہ پُرتکلف دعوتوں اور شراب کی بوتلوں کے سہارے نئے نئے دوست پیدا کر لیتے ...... بہرصورت ان کی بارہ دری میں صبح پو پھٹنے تک روشنی ضرور رہتی۔ اور رات کی خاموشی میں تاش پھینٹنے کی آواز گلی میں دُور دُور تک سنائی دیتی رہتی۔ آندھی اور طوفان ٹل سکتے تھے۔ مگر ٹھاکر کا یہ شوق نہیں ٹل سکتا تھا!

اور اس رات بھی جب بنسی نے حویلی کے صحن میں کھڑے ہو کر بارہ دری کی طرف دیکھا، تو کھڑکیوں کے پردوں میں سے چھن چھن کر نظر آنے والی روشنی اندر زندگی کے آثار کا پتہ دے رہی تھی۔ بنسی کو خفیف سا تعجب بھی ہوا، کیونکہ اسے معلوم تھا پچھلے تین دن سے ٹھاکر کے یہاں ایک بھی مہمان یا دوست نہیں آیا تھا۔ اور یہ ٹھاکر کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اتنے دن انہوں نے بغیر جوا کھیلے گذار دیئے تھے۔ بنسی یہ بھی جانتا تھا کہ انہوں نے یہ دن کس بے چینی اور کرب کے عالم میں گذارے تھے! ٹھاکر کے بچپن کے دوست بابو کنج بہاری بھی کسی کام سے دلی چلے گئے تھے۔ ورنہ ایسے آڑے وقت وہ ضرور کام آتے۔ جڑیں سوکھ جانے پر پیڑ کی شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر جھڑنے والے پتّوں کی طرح ٹھاکر کے دوسرے سب دوست ساتھ چھوڑ بیٹھے تھے۔ لیکن ایک وہی تھے جو ابھی تک رسم نبھائے جا رہے تھے ...... اور اس رات اتنی دیر گئے بیٹھک میں روشنی دیکھ کر

بنسی نے سوچا کہ شاید بابو کنج بہاری شہر سے واپس آ گئے ہیں۔

حویلی کے وسیع صحن میں نوہرے کی چھوٹی سی دیوار کے ساتھ ایک کچا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس پر کسی زمانے میں تلسی کا پیڑ تھا۔ لیکن آج کل وہاں پیڑ کی بجائے گوبر کے دو چار اپلے پڑے دہکتے رہتے تاکہ وقت بے وقت ٹھاکر کے خوبصورت مرادآبادی حقے کو گرم رکھا جا سکے۔ بنسی چبوترے پر ان اپلوں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس کی چلم بھی پاس ہی دیوار سے لگی دھری رہتی تھی۔ اور تمباکو کا انٹ ہنٹ پگڑی کی تہوں میں اُڑسا موجود رہتا۔ اپلوں پر سے راکھ پھونک کر اس نے چلم بھری اور ایک لمبا کش لے کر دیوار کے سہارے آرام سے بیٹھ گیا۔ اس رات اس کے ذہن میں بیتے دنوں کی بہت سی یادیں اجاگر ہوتی جا رہی تھیں .....

وہ اسی حویلی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ بڑے ٹھاکر کا پُرانا نمک خوار تھا۔ ان دنوں بڑے ٹھاکر کے پاس نہ یہ لمبی چوڑی حویلی تھی، اور نہ اتنی بڑی زمین جائیداد۔ یہ سب تو انہیں بھگوان نے اپنی کرپا سے چھپر پھاڑ کر ایک ہی دن میں بخش دیا تھا! سن ستاون کے غدر میں انہوں نے دو انگریز افسروں کی جان بچائی تھی۔ بس پھر کیا تھا! انہیں دِلّی بلا کر انعام واکرام سے سرفراز کیا گیا۔ بہادری اور وفاداری کی سند عطا کی گئی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک گاؤں اور پانچ سو بیگھے زمین ان کے نام لکھ دی گئی۔ ٹھاکر رنجیت سنگھ ایک ہی جست میں علاقے کے سب سے بڑے زمیندار بن گئے۔ راتوں رات ان کے پُرانے کچے گھروندے کی جگہ یہ شان دار حویلی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گاؤں کی رعیت چوبیس گھنٹے آگے پیچھے خدمت میں لگی رہتی۔ جائیداد کی دیکھ بھال اور لگان کی وصولی کے لئے منیم رکھے گئے۔ بنسی نے اپنے باپ سے سُنا تھا کہ جب بڑے ٹھاکر سورگباش ہوئے تو چھوٹے ٹھاکر کے لئے خزانے میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد چھوڑ گئے تھے۔

جوے کی لت ٹھاکر روپ سنگھ کو بچپن سے تھی۔ اب جو یہ ڈھیر سی دولت ہاتھ لگی تو جوے کے ڈھنگ بھی بدل گئے۔ شہد پر مکھیوں کی طرح ان کے یار دوست بھی منڈلاتے ہوئے آ جمع ہوئے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ بمبئی اور پونا کی ریسوں کی بات ہی اور ہے!

پھر کیا تھا۔ ٹھاکر صاحب ساری پونجی ایک ہی سیزن میں ہار بیٹھے۔ لنڈے منڈے واپس آئے تو روپیہ پیدا کرنے کی نئی نئی تدبیریں سوچنے لگے جائیداد کی مستقل آمدنی ان کے شوق پورا کرنے کے لئے قطعی ناکافی تھی ...... چنانچہ ان کے ذہین دماغ نے روپیہ پیدا کرنے کی ایک بڑی آسان اور موثر ترکیب ڈھونڈ نکالی ـــــــ چوریاں اور ڈاکے! ان کے مخبر سارے علاقے میں گھوم پھر کر مقامات اور موقعوں کی نشان دہی کرتے۔ ٹھاکر صاحب کی سرکردگی میں اسکیمیں بنتیں۔ نقب لگتے۔ مسلح حملے کئے جاتے اور گہنوں اور روپوں پیسوں سے لدی تھیلیاں ان کی بیٹھک میں پہنچ جاتیں۔ یا پھر راتوں رات ایک گاؤں کے مویشی دوسرے گاؤں پہنچ جاتے۔ سودا ہوتا اور نقدی ٹھاکر صاحب کی خدمت میں حاضر کر دی جاتی۔ بٹوارہ ہوتا اور سردار کا حصہ ٹھاکر صاحب کو ملتا۔ کہیں کوئی گڑبڑ یا اونچ نیچ ہو جاتی تو تھانیداروں کے منہ اپنی کو بند کرنے پڑتے۔ کبھی کبھی قتل و خون کی واردات بھی ہو جاتی ایسے موقعوں پر تھانیداروں کی بن آتی ..... لیکن بہر حال یہ کاروبار بڑا کارگر اور نفع بخش ثابت ہوا۔ سارے علاقے پر ٹھاکر کی دھاک بیٹھ گئی۔ لوگ بطور تاوان بھاری رقمیں نذر کرنے لگے۔ ٹھاکر کو جو آمدنی زمینوں سے عمر بھر نصیب نہ ہوتی وہ انہیں گھر بیٹھے ان طریقوں سے ہونے لگی!

بنسی کو ایک عرصے تک ٹھاکر کی ان مصروفیات کا علم نہ ہو سکا تھا۔ اس کی دنیا تو بس مویشیوں سے کھیتوں تک محدود تھی۔ حویلی میں نوکروں کی کمی نہ تھی۔ پھر بھی اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال وہ خود ہی کرتا۔ اور دن رات اپنے کاموں میں مشغول رہتا۔ پہلے پہل ٹھاکر کے اس انوکھے کاروبار کی افواہیں اس کے کانوں تک پہنچیں تو اسے یقین نہ آ سکا۔ مگر دھیرے دھیرے ہر بات اس کی سمجھ میں آتی چلی گئی۔ آخر اس نے بھی دنیا دیکھی تھی۔ اور اب تو اس کی کنپٹیوں پر سے بال بھی سفید ہونے لگے تھے ...... اس رات چبوترے کی دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے جب اس نے ان باتوں کو یاد کیا تو ایسے محسوس ہوا جیسے یہ سب حقیقت نہیں، خواب تھا.......

شراب اور جوئے کے ساتھ ساتھ ناچ رنگ کی محفلیں بھی شروع ہو چکی تھیں۔

ٹھکرائن تو خیر شادی کے تیسرے برس ہی کچھ اولاد نہ ہونے کے غم میں، اور کچھ ٹھاکر کے مشاغل کے غم میں، بھگوان کو پیاری ہوگئیں۔ مگر ٹھاکر کی بیٹھک میں آئے دن طوائفوں کا تانتا بدستور بندھا رہا آج میرٹھ سے طائفہ آیا ہے تو کل بلند شہر سے، پرسوں دلی سے پارٹی آرہی ہے تو ترسوں نحوہ جے سے .... مجرا ہو رہا ہے، یار دوست داد دے رہے ہیں۔ شراب پانی بنی ہوئی ہے ..... اور پھر ٹھاکر تکیے کے نیچے سے تاش کی گڈی نکالتے ایک ایک بول ہزار دو ہزار تک جا پہنچتا۔ کسی کے پاس رقم ختم ہو جاتی تو ٹھاکر ادھار دیدیتے۔ جس کی وصولی کی نوبت کبھی نہ آتی۔ دن رات یوں گذر جاتے جیسے شروع ہی نہیں ہوئے تھے۔

اور پھر بنسی کو وہ دن بھی یاد آیا جب کسی نے آکر ٹھاکر کی بیٹھک میں خبر دی تھی کہ آزادی آگئی! بڑی دیر بعد ٹھاکر کی سمجھ میں آیا تھا کہ آزادی سے مراد انگریزوں کی غلامی سے نجات ہے۔ بڑی متانت سے مسکرا کر انہوں نے کہا تھا ——— "ہونہہ ہمیں کیا۔ کوئی آئے، کوئی جائے!..... لوگ اس آزادی پر خوش ہیں تو کوئی اچھی ہی بات ہوگی" ——— لیکن دل میں ٹھاکر کو انگریزوں کے چلے جانے کا ملال ضرور ہوا تھا۔ وہ ان کی شرافت اور سخاوت کے بے حد معترف تھے۔ وہ نہ ہوتے تو بڑے ٹھاکر کو اتنی ساری جائیداد کون دے دیتا۔!

آزادی کے ساتھ ہی فساد اٹھ کھڑے ہوئے لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ مسلمان گاؤں چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے تو ٹھاکر اور ان کے چیلوں کے لئے ایک اور راستہ کھل گیا۔ لوٹ کا مال تو الگ رہا۔ بھاگنے والوں کی جائیداد اور مال و اسباب کوڑیوں کے دام بک رہے تھے۔ ٹھاکر کا خزانہ بڑی تیزی سے بھرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ آزادی کی خوشی میں ان کی محفلوں کی ہنگامہ آرائیاں بھی دوبالا ہوگئیں۔

لیکن جلد ہی انہیں محسوس ہونے لگا کہ یہ آزادی بہت مہنگی پڑی ہے۔ لوگوں میں انقلاب کے نام سے ایک عجیب ہلچل سی پیدا ہوگئی تھی۔ ان کی رعایا دن بدن گستاخ اور نافرمان ہوتی جارہی تھی جو آنکھیں ان کے آگے زمین سے اوپر نہ اٹھتی تھیں،

اب ان میں نفرت اور غصے کے رنگ جھلک رہے تھے۔ مقررہ لگان سے ایک پائی بھی بڑھ کر وصول کرنا ان کے منیموں کے بس سے باہر ہو گیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر تو یہ کہ چوریوں اور ڈاکوں سے ہونے والی آمدنی گھٹ کر صفر ہو گئی تھی!

——— ٹھاکر کا سارا رعب دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ علاقے میں ان کا نام تو پہلے ہی سے بدنام تھا۔ اب لوگ کھلے بندوں ان کی اور ان کے چیلوں کی نشان دہی پولیس میں کرنے لگے۔ اور پولیس کے یہ نئے نئے نوجوان افسر ٹھاکر کے بس میں بڑی مشکل سے آتے تھے ان کے پیچھے بھی انہوں نے بڑی بڑی رقمیں صرف کیں، رشوتیں دیں، لیکن یہ لوگ بڑے بے وقوف اور بزدل ثابت ہوئے! واقعات کی عمدگی سے "ستر پوشی" کرنا انہیں آتا ہی نہ تھا۔ یا پھر شاید ان پر بھی عوام کا ڈر سوار ہو گیا تھا..... نتیجہ یہ کہ ٹھاکر کے آدمی دھڑا دھڑ دھر لئے گئے۔ خود ٹھاکر کو کئی بار عدالت کی سیڑھیاں چڑھنی پڑیں۔ قتل کے ایک کیس میں تو ان کی جان بال بال بچ گئی۔ خزانے کا منہ کھول دیا، تب کہیں جا کر بات دب سکی۔!

ٹھاکر کے پرانے دوست بابو کنج بہاری نے کئی بار سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن ٹھاکر صاحب نے اپنے لیل و نہار بدلنے سے صاف انکار کر دیا۔

"ٹھاکر جی، وقت کے دھاروں کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ ذرا چونکیے..... اپنے اردگرد دیکھیے، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے! آپ کو بھی اپنے رنگ ڈھنگ بدلنے ہوں گے ورنہ......" بابو صاحب کہتے کہتے رک جاتے۔

"ورنہ کیا؟" ٹھاکر غصے سے چیخ اٹھتے۔

"آپ تباہ ہو جائیں گے" بالآخر بابو صاحب کہہ اٹھتے "نام و نشان تک باقی نہ رہے گا..... زمانے سے ٹکر لینے کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

"مگر میں زمانے سے نہیں ڈرتا..... میں کسی سے نہیں ڈرتا" ٹھاکر کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگتے۔ بابو کنج بہاری مسکرا پڑتے۔ "ٹھاکر جی۔ آخر کب تک یہ نادر شاہی مزاج، یہ نوابی ٹھاٹ چل سکے گا۔؟"

"چلے گا" ٹھاکر کا بوڑھا جسم کانپنے لگتا۔ "ٹھاکر روپ سنگھ نے آج تک

کسی سے ہار نہیں مانی۔"

"ہار تو ہو بھی چکی ٹھاکر۔" بابو صاحب کہتے "آپ کے خزانے میں اب کیا رہا ہے! ...... اور جب سب کے ساتھ آپ کی جاگیر بھی حکومت کے ہاتھوں میں چلی جائے گی، تب کیا کریں گے آپ؟"

جواب دینے کی بجائے ٹھاکر چپ ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو انہیں بھی محسوس ہوتا جیسے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی جا رہی ہے۔ اور وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کرسی کو مضبوطی سے تھام لیتے۔ ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر زردی چھا جاتی۔ جیسے کوئی خزاں رسیدہ پودا۔ بنسی انہیں اس حالت میں دیکھتا تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ اس کے دل میں ٹھاکر کی محبت کم نہ ہوئی تھی۔

ٹھاکر نے ہار نہیں مانی۔ اگرچہ ان کی زندہ دلی اب جھلاہٹ اور چڑچڑے پن میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لوگ ان کے سائے سے کترانے لگے تھے۔ پرانے یار دوست ساتھ چھوڑ بیٹھے تھے۔ ٹھاکر کی دوستی ننگِ عزت سمجھی جانے لگی تھی۔ صرف چند موقع پرست تھے جو بھاگتے چور کی لنگوٹی بھی چھوڑنے کے قائل نہ تھے۔ اور جونک کی طرح ان سے چمٹے ہوئے تھے۔ آمدنی کے ذرائع بند ہو جانے پر بھی ٹھاکر کی رات کی محفلیں بدستور زندہ تھیں۔ طائفے آنے بند ہو گئے تھے۔ لیکن شراب اور جوئے کو چھوڑنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ جلی ہوئی رسّی کے لرزتے بل، ہوا کے ایک تند جھونکے کے منتظر تھے جو ان کو بھی اُڑا لے جائے۔

———— رات کے پچھلے پہر کی خوشگوار نمی فضا میں تحلیل ہونے لگی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے لطیف جھونکے بھی تھوڑی دیر سے سرسرا اُٹھتے۔ بنسی کو بڑا سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن نیند آنے کے اب بھی کوئی آثار نہ تھے۔ نہ جانے کیوں اس کا ذہن سوچوں کے دلدل میں پھنس کر رہ گیا تھا......

حویلی کا یہ وسیع صحن جو اب خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا کسی زمانے میں نوکروں اور بیگاروں کی چارپائیوں سے یوں بھر جاتا تھا جیسے مرغیوں سے ڈربہ۔ مگر آج

وہاں ایک بھی چارپائی نہ تھی، سارے نوکر حویلی سے اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے سورج کے ڈھلتے ہی سائے!......

ایک دن تو منگلو بھی کہہ اٹھا تھا :-

"باپو، تم کب تک ٹکے رہو گے؟ ——— ایسے پاپی کا تو پانی بھی حرام ہے۔" لیکن یہ سُن کر بنسی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔اس نے کہا تھا۔

"نہیں بیٹا- ہم نے ٹھاکر کا نمک کھایا ہے۔ ہمارے پُرکھوں نے اسی حویلی میں دم توڑا ہے۔...... ٹھاکر کے دن پھر گئے ہیں تو کیا ہم بھی اپنا خون سفید کر لیں؟"

دراصل بنسی کی رگوں میں دوڑنے والا بوڑھا خون اپنی ساری حرارت کھو چکا تھا۔ ایسی بات وہ اب سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یا پھر شاید اس کی وجہ ٹھاکر کے مویشی تھے جنہیں بنسی نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے پالا تھا۔ جن سے وہ منگلو جیسا پیار کرتا تھا- اور جن کی جدائی کا تصور بھی اسے بے چین کر دیتا تھا۔

——— بنسی نے آخری کش لے کر چلم کو چبوترے پر اوندھا دیا۔ ٹھاکر کی بیٹھک میں روشنی ابھی تک باقی تھی۔ وہ سوچنے لگا بابو کنج بہاری کئی دن بعد آئے ہیں۔ ادھر تین دن سے ٹھاکر نے تاش کی گڈی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ کوئی آیا ہی نہ تھا جس کے ساتھ کھیل سکتے۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر انہوں نے یہ دن گذارے تھے۔ رات کو سوتے تو تاش کی گڈی سرہانے رکھ لیتے......... اتنا بڑا وقفہ ان کے کھیل میں پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ آج موقعہ ملا ہے۔ ساری کسر نکالے بغیر بابو صاحب کو واپس نہ جانے دیں گے!

اور اب ہوا کے جھونکے تیز ہو چلے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی تیزی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے صبح تک تند آندھی شروع ہو جائے گی۔ پرانے نیم کی شاخیں کھوکھلے تنے پہ دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ انکی سائیں سائیں کی آواز نے رات کے اندھیرے کو اور خوفناک بنا دیا تھا۔ نیم کا یہ پیڑ ٹھاکر کے مزاج کی طرح بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور بنسی نے

کئی بار سوچا تھا کہ اسے گرا دینا ہی بہتر ہے۔ ورنہ ایک دن کسی زور کی آندھی میں وہ خود نوہرے کے چھپر پر ڈھیر ہو جائے گا...... اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے بیلوں کا خیال آ گیا۔ رات تھوڑی رہ گئی تھی اور اب چل کر سو جانا چاہیئے۔ اس لئے سوچا۔

لیکن اسی لمحے ٹھاکر کی بیٹھک کا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ نظریں اٹھا کر اس نے سامنے صحن کی دوسری جانب دیکھا۔ بیٹھک کے کھلے دروازے سے روشنی کی ایک سفید چادر پھوٹ رہی تھی۔ اور اس چادر میں نہائے ہوئے ٹھاکر صاحب کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مراد آبادی حقے" کی خوب صورت چلم تھی۔ جس پر جالی دار سرپوش ڈھکا تھا۔ اتنی دور سے بھی بنسی کو ان کے جسم کے خدوخال اچھی طرح نظر آ رہے تھے...... کسی زمانے میں ٹھاکر اپنے کوتاہ قد کے باوجود بڑے وجیہہ آدمی لگتے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ، بھرے بھرے ہاتھ پیر اور تیز روشن آنکھیں...... لیکن ادھر کچھ دنوں سے نئی نئی فکروں نے جسم کا سارا رس نچوڑ لیا تھا! قتل کے مقدمے کے بعد تو ان کے چہرے کی رونق جیسے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی تھی جسم پر جگہ جگہ ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور چہرے کی چمک دار چکنی جلد پر جھریوں کی لکیریں نمودار ہونے لگی تھیں۔ شاید عمر میں پہلی بار انہیں محسوس ہوا تھا کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں!

دور سے روشنی میں ٹھاکر کا ستا ہوا زرد چہرہ عجیب بھیانک سا لگ رہا تھا! جیسے آخری پہر کا چاند ڈوبتے ڈوبتے کھنڈروں کے پرے کسی ٹھنٹھ میں اٹک کر رہ گیا ہو...... اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے وہ بنسی کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں چلم بری طرح لرز رہی تھی۔ بنسی نے ٹھاکر کو اس حالت میں دیکھا تو دل بھر آیا۔ 'کبھی ٹھاکر روپ سنگھ کو اپنا حقہ بھرنے خود ہی آنا پڑے گا' یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ دوڑ کر وہ ان کے پاس گیا اور ہاتھ سے چلم لے لی۔ ٹھاکر اسے دیکھ کر یوں چونکے جیسے اچانک چوری کرتے پکڑ لیے گئے ہوں!

"کون؟ بنسی......!" رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ "پتہ نہیں شامو کہاں مر گیا ہے!......"

"انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو خود ہی چلا آیا" ——— انہوں نے جلدی سے صفائی پیش کی اور واپس لوٹ گئے۔

——— ہوا کا ایک تیز جھکڑ بوڑھے نیم کے کھوکھلے تنے کو بُری طرح ہلاتا ہوا گذر گیا۔ شاخوں کی چیخیں رات کی خاموشی میں دُور دُور تک پھیل گئیں۔ بنسی نے سوچا آندھی صبح ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جائے گی ....

اور جب چلم بھر کر وہ ٹھاکر کی بیٹھک میں پہنچا، تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی! اس نے سمجھا تھا کہ ٹھاکر صاحب بابو کنج بہاری لال کے ساتھ کھیل رہے ہیں مگر وہاں کوئی نہ تھا! ——— تاش کے پتے فرش پر پھیلے ہوئے تھے اور بیٹھک کا تمام قیمتی سامان بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ جیسے کسی نے جھلاہٹ میں ٹپک دیا ہو .... بیچ میں ٹھاکر صاحب بیٹھے تھے۔ خاموش اور کسی سوچ میں غرق! ان کا چہرہ دیکھ کر بنسی کو خوف سا لگنے لگا۔ جیسے کسی پاگل آدمی کا چہرہ دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کسی اندرونی اضطراب اور بے چینی کے باعث ان کا جسم بُری طرح لرز رہا تھا۔

تپیے پر چلم رکھ کر بنسی نے سوچا کہ وہاں سے جلدی سے کھسک جائے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ٹھاکر کی کانپتی ہوئی بھیانک آواز نے اس کے قدم روک دیئے .....

"ذرا ٹھہرو بنسی ——— کہاں جا رہے ہو؟" ٹھاکر جیسے کسی دوسری دنیا سے بول رہے تھے۔

"کہیں نہیں حضور ———" بنسی نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"تو آؤ بیٹھ جاؤ .... آج تم ہی سے دو دو ہاتھ ہو جائیں!" ——— اور وہ جھک کر فرش پر سے تاش کے پتے جمع کرنے لگے۔ ▲▲

صُبح کا بُھولا

اس دن وہ بہت سویرے نکل پڑا تھا۔ آسمان کے مٹیالے دھندلکے میں اِکّا دکّا تاروں کے جگنو چمک رہے تھے۔ پورب کے ایک کونے میں بھور کی پہلی سپیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ کاندھے پر ہل اور ہاتھوں میں بیلوں کی رسی تھامے جب بھورا گلی میں آیا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فرش کی اینٹوں پر قدموں کی آواز دور تک چوباروں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھی۔ ہوا کے سبک جھونکوں میں نمی کے ساتھ جنگل کی وحشی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔ اتنے سویرے چار پائی چھوڑتے ہوئے بھورے کو بڑا برا لگا تھا۔ بڑا آلکس آیا تھا...... جون کے تپتے دنوں اور دہکتی راتوں کے بعد صبح صبح کے شبنمی نمیدہ یہہ چند لمحات ہی تو ہوتے ہیں، جب آدمی چین کی نیند سو لیتا ہے۔ مگر بھورے کو اس دن بہت سا کام کرنا تھا۔

گلی سے نکل کر جب وہ پتھروں کے فرش پر پہنچا تو ایک آدھ آدمی اور بھی نظر پڑا۔ کسی کسی گھر سے چکی کی آواز بھی آنے لگی تھی۔ مل گجے اجالے میں اس کے بالائی سے سفید بیلوں کی جوڑی بڑی شاندار لگ رہی تھی۔ بھورا انہیں پیار سے "بگلے" پکارتا تھا۔

پیپل والے کنوئیں پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ بگلے بھی رک گئے۔ وہ روز یہاں پانی پیتے تھے۔ چبوترے کے نیچے مویشیوں کے لئے ایک چوبچہ ہمیشہ پانی سے بھرا رہتا تھا۔ ہل نیچے رکھ کر بھورے نے بیلوں کو حوض پر چھوڑ دیا، اور خود اس کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ بغل کی پتلی گلی سے کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔

"جے رام جی کی چودھری...... کہاں نکل پڑے اتنے سویرے؟" آنے والا

کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گیا، اور ڈول پر سے رسی کھولنے لگا۔

"کہیں نا - جرا کھیتوں پر جاؤں ہوں۔" بھورا نے جواب دیا "کیا نہانے آئے ہو کنھیا؟"

کنھیا کو دیکھ کر بھورے کو کوئی خوشی نہیں ہوئی - اس کا باپ آزادی کے وقت پچھمی پنجاب سے آکر اس کے گاؤں میں بس گیا تھا - ان بن بلائے مہمانوں کو گاؤں میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا - کنھیا نے قمیص اتاری، دھوتی کا کسوٹا بھرا، اور ڈول کھینچ کر نہانے بیٹھ گیا۔

"بڑا مزا آرہا ہے چودھری ...... اس کنویں کا پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔" ڈول سر پر خالی کرتے ہوئے کنھیا بولا ——— "میری مانو - تم بھی ایک ڈول سے پنڈا بھگوتے جاؤ" اور ہی ہی کر کے دانت نکالے ہنسنے لگا۔

بھورے کو اسکی ہنسی پر اور غصہ آیا - جی چاہ رہا تھا کہ اس سے بولے ———

" او رئیس کی اولاد، جرا مینڈھ سے پرے ہٹ کر نہا - جھوٹا پانی گرا کر کنویں کو گندا کیوں کئے دے رہا ہے؟ ———" مگر وہ بولا کچھ نہیں۔

ان ریفیوجیوں نے تو سارے گاؤں کا پانی گندا کر دیا ہے ——— اس نے سوچا۔

بیل پانی پی چکے تھے - ہل کندھے پر رکھ کر اس نے ہاتھ کی رسی کو ہلکا سا جھٹکا دیا ——— "لے اب چلو، میرے بگلو"۔

" تمہارے بگلوں کو تو نظر لگ رہی ہے چودھری"! کنھیا نے پھر ایک بار گفتگو کا سلسلہ جوڑنا چاہا - مگر بھورا بے رخی سے پلٹ آیا۔

اس کا جی کبھی ان لوگوں سے بات کرنے کو نہیں چاہا تھا - "بگلوں" کی تعریف سن کر بھی نہیں - بیسیوں بار اپنے باپو سے وہ ان لوگوں کی برائیاں سن چکا تھا ——— سسرے، کام چور، نکھٹے - اور جانے کیا کیا! عورتیں اپنے بچوں کو ان کے سائے سے بچاتی تھیں، کیونکہ ان کی عورتیں لڑاکا، اور بچے فیل مچانے والے تھے - جہاں وہ بسے تھے، غلاظت اور سڑاند بڑھا دی تھی - چند ایک نے جھوٹے کلیموں پر زمینیں الاٹ کرا لی تھیں - مگر دن رات محنت کر کے اتنی پیداوار کر لی جو دوسرے کبھی نہ کر سکے - بیوپار میں گھسے تو ایسے کہ جوڑ توڑ سے گاؤں

سارا بیوپار قبضے میں کر لیا۔ اب کون مقامی آدمی انہیں پسند کرتا؟

"کیوں نہ انہیں نکال باہر کریں! ..... ہم نے بلایا تھوڑی تھا ان بے گھروں کو؟"۔

——— ایک رات بوڑھا نمبردار چوپال میں پیخ پڑا تھا۔

بھورا اپنے بیلوں کو لئے آبادی سے باہر آ گیا۔ خیراتی ہسپتال کے سامنے جہاں لاریوں کا اڈا تھا۔ لوگ ابھی تک سڑک کے کنارے چارپائیاں ڈالے سوئے پڑے تھے ——— لاریاں بھی سوئی پڑی تھیں۔ صرف ایک میں ڈرائیور بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ شاید صبح اس کی لاری پہلے نمبر پر تھی۔

آگے گندے نالے کا پل تھا۔ پل کے پرے جوہڑ کے کنارے جامنوں کے پیڑوں تلے گاؤں کی بھیڑیں اور بکریاں جمع ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ جوہڑ میں سنگھاڑوں کی بیل ہمیشہ کی طرح پھیل رہی تھی .... وہ جب چھوٹا تھا تو بھیکو کے ساتھ دوپہر کے سناٹے میں سنگھاڑے چرا چرا کر کھایا کرتا تھا۔ اور جب رکھوالا ان کو مار دیتا تو دونوں تیر کر دوسرے کنارے جا پہنچتے اور بیلو اور کریل کی جھاڑیوں میں چھپ جاتے۔ یا اینٹوں کے بھٹے پر چڑھ کر بوڑھے رکھوالے کا منہ چڑاتے ....

"بجے رام جی کی کاکا .... بڑے تڑکے چل دئیے آج تو!" کوئی بھورے کے پاس سے گذرتے ہوئے بولا۔ اور بھورا بچپن کے میٹھے سپنوں سے چونک پڑا۔ یہ دھلیا چرواہا تھا، جو اپنا ریوڑ سنبھالنے جامنوں تلے جا رہا تھا۔

"آج بیری والے دونوں بیگھے جوتنے ہیں۔" بھورے نے جواب دیا "پڑے پڑے سوکھ رہے ہیں"۔

"لونڈے کو بھیج دیا ہوتا ——— آخر وہ کب کام آئے گا؟"

"ایسا نا ہے دھلیا۔ وہ بہو کو لانے سسرال گیا ہے۔ میں نے سوچا، میں ہی چلا چلوں"۔

مگر دھلیا اپنا لٹھ سنبھالتا، بائیں پگ ڈنڈی پر مڑ گیا تھا .... کسی زمانے میں دھلیا کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن شربتی بھی ہوا کرتی تھی۔ ننھی منی سی شربتی، جو

رنگ برنگے گھاگھروں میں گڑیا سی ناچتی پھرتی ۔ اور بھورا محض اس کی خاطر روز صبح سویرے جامنوں کے پیڑوں تلے آبیٹھتا تھا ۔ اور پھر ،،،،،،، دھیرے دھیرے شربتی بھی جان گئی تھی وہ روز کیوں وہاں آبیٹھتا ہے ۔ اور پھر ان کی معصوم محبت کا سہما سہما رومان شروع ہوا تھا۔ صبح دم کھیتوں میں چمکتے ہوئے پانی کی طرح پاکیزہ !

لیکن وہ دن کسی بھولے بھٹکے بادل کے سائے کی طرح بہت جلد گذر گئے ۔ شربتی کا بیاہ کسی اور گاؤں میں ہوگیا ۔ اور بھورے کے دل کی بستی جامنوں کی چھاؤں کی طرح سونی رہ گئی ۔

بھورا ایک جھرجھری لے کر آگے بڑھ گیا ۔

پتلی سی پگ ڈنڈی کھیتوں کی مینڈھ پر، سرکنڈوں کے جھنڈوں میں سے بچتی بچاتی ریل کی پٹری کی طرف جا رہی تھی جہاں بھورے کے کھیت تھے ۔ تھوڑی تھوڑی دور اس پگ ڈنڈی سے کوئی چھوٹی سی شاخ پھوٹ کر کھیتوں میں غائب ہوجاتی یا پاس کی جھاڑی سے کوئی خرگوش اچھل کر گیند کی طرح لڑھکتا پھسلتا نظروں سے اوجھل ہوجاتا ۔ بھورا اور اس کے بیل متانت کے ساتھ پگ ڈنڈی کے بلوں پر آگے بڑھتے جا رہے تھے ۔ کھیتوں میں جگہ جگہ کھاد کی ڈھیریاں بنی ہوئی تھیں جن کے درمیان تیتروں اور بٹیروں کی ٹولیاں بھی نظر آجاتیں ۔ درختوں پر چڑیوں کا شور اب کم ہوچلا تھا ۔ مگر اوپر آسمان کی وسعتوں میں ٹٹیریوں کی سیٹیاں ابھی تک تیر رہی تھیں ______

کھیتوں پر پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا دن نکل آیا تھا ۔ ریل کی پٹریاں دور تک سلگتے ہوئے فیتوں کی طرح چمک رہی تھیں ۔ کچھ دور، جہاں نہر کا پل تھا، مزدور ہاتھوں میں بیلچے لئے لائن پر کام کر رہے تھے ۔ بھورے کے کھیت لائن کے دوسری طرف تھے ۔ بیری کی چھاؤں میں سستا کر اس نے بیل جوڑ دئے ...... سدھے ہوئے جانور رسی کے ہلکے سے اشارے پر بندھی ہوئی رفتار سے کھیت کے دوسرے سرے تک جا پہنچتے، اور پھر لوٹ آتے ۔ پیچھے ہل پر مضبوطی سے پیر جمائے بھورا کھڑا رہتا ۔ اور زبان سے عجیب عجیب آوازیں نکال کر بیلوں کی رہبری کرتا جاتا ۔ کھیت کے سپاٹ سینے پر ایک کے بعد ایک چھوٹی چھوٹی، بھوری بھوری نہریں بنتی چلی جاتیں ....

بھورے کے آگے کلوا کے کھیت تھے ۔ مگر وہ آج نہیں آیا تھا ۔ اس کے آگے

تیجو نائی کے کھیت تھے ۔ ادر وہاں اس کا بیٹا ہل چلا رہا تھا ۔ پرلی طرف بنجر ٹیلوں کے آگے ایک ٹریکٹر چل رہا تھا ۔ آموں کے جھنڈ سے ٹیوب ویل کی کراہیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں ۔ اور جب اس ماحول کی یکسانیت، کو جھنجھوڑتی ہوئی کوئی ریل گاڑی کھیتوں کے بیچ سے دندناتی ہوئی گذر جاتی تو ایک ذری دیر کے لئے سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر کام روک کر کھڑے ہو جاتے۔

اور ان کی نظریں پٹریوں پر دور تک ریل کے تعاقب میں پھسلتی جاتیں ——— گاؤں کے کتنے کڑیل جوان ان ہی ریلوں میں بیٹھ کر جانے کہاں کہاں بکھر گئے تھے' ——— یہ ریلیں لوگوں کو لے جانا جانتی ہیں، واپس نہیں لاتیں !

اور اب سائے سمٹنے لگے تھے ۔ سورج کی نرم کرنوں میں رچی ہوئی گلابی ہوائیں کبھی کی ختم ہو چکی تھیں ۔ ان کی جگہ گرم ہوا کے جھکڑوں نے لے لی تھی ۔ زمین تپنے لگی تھی اور کسان چپ چاپ سر نیوڑھائے ہل چلا رہے تھے ۔ کھیتوں پر سناٹا ہانپ رہا تھا ۔ جنگل کے پنکھ پکھیرو بھی پٹیروں میں جا چھپے تھے ۔ اس چل چلاتے سناٹے میں مزدوروں کے بیلچوں کی آوازیں اور بھی چبھتی ہوئی لگ رہی تھیں جو لائن کے روڑوں سے ٹکرانے سے پیدا ہو رہی تھیں ۔

اور جب سورج سر پر آ گیا اور بھورے کے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ نکلا تو اس کی گھر والی روٹی لے آئی ۔ بھورے نے آدھے سے زیادہ کام ختم کر لیا تھا اور اب تھکن محسوس ہو رہی تھی ۔ بیلوں کو کھول کر ریل کی پٹری کے پاس ایک گھنے شیشم کے نیچے باندھ دیا ۔ اسی کی گھنی چھاؤں میں خود بھی روٹی کھانے بیٹھ گیا ۔ لائن والے مزدور بھی اب رک گئے تھے اور پٹری کے دوسری طرف کسی درخت کے نیچے سستا رہے تھے ۔

بھورا روٹی کھا چکا تو گھر والی واپس چلی گئی ۔ لیکن وہ اسی طرح شیشم کی ٹھنڈی چھاؤں میں پڑا رہا ۔ ابھی اور تھوڑی دیر سستا لوں اس نے سوچا ۔ مگر اسی لمحے وہ چونک پڑا ۔ اس کے سامنے لائن پر کام کرنے والوں میں سے ایک بوڑھا مزدور آ کھڑا ہوا تھا ۔ جس کی مرجھائی ہوئی آنکھیں چہرے کی جھریوں میں دھنس گئی تھیں ۔

" بھیا ۔ ایک بات مانو گے میری ؟" بچوں کی سی سادگی سے اس نے پوچھا ۔ " اک ذرا کی ذرا یہ ہل بیل لے کر تمہارے کھیت کو میں جوت دوں ؟ " آواز کی لرزش سے جذبات کی شدت

کا پتہ چلتا تھا۔

بھورے کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ حیران نظروں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔

"گھبراؤ نہیں بھیا۔ مجھے ہل چلانا خوب آتا ہے" آگے بڑھ کر وہ بیلوں کو بڑے پیار سے تھپ تھپانے لگا۔ "کیسے پہاڑ سے جانور ہیں!" ——— اس کی پتھر سی سخت اور بے جان آنکھوں میں ایک نئی چمک آ گئی تھی۔ جیسے بچے کو کھلونوں کی دکان مل جائے!

"جوت لو بھائی۔ اپنے ہی جانور سمجھو" بھورے سے انکار نہ ہو سکا۔ "بڑے سیدھے ہیں یہ بیل،..... ایک اشارے پر چل نکلیں گے۔" اور دل ہی دل میں سوچا ہرج ہی کیا ہے! وہ تو آپ ہی صبح سے ہل چلاتے تھک چکا تھا۔

اور شیشم تلے سے بیلوں کو کھولتے ہوئے بوڑھے مزدور کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا ——— "جانتے ہو بھیا،........ تمہیں بھورے سے ہل چلاتے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں بیلچہ تھا، مگر آنکھیں تم پر ہی تھیں!"

اور جب ہل بیل لئے وہ کھیت پر چلا گیا تو بھورا سوچنے لگا..... یہ کیسا آدمی ہے! بھلا اس تپتی ہوئی دوپہر ہی میں کس کا جی چاہے گا ہل چلانے کو؟ اور پھر.... ہل جوتنے میں کیا رکھا ہے؟..... کوئی پاگل تو نہیں ہے؟۔

اور اب بیلوں کو جوڑ کر وہ بڑے انہماک سے ہل چلا رہا تھا۔ اس کے بوڑھے اور غیر مانوس ہاتھوں میں بیلوں کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شائد دھیرے دھیرے وہ کچھ گنگناتا بھی جا رہا تھا۔ اور شیشم کی چھاؤں میں بیٹھا بھورا محویت کے عالم میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ لائن والے دوسرے مزدور بھی اس کے پاس آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی اسی حیرت اور دلچسپی سے اسے تک رہے ہیں۔ بھورا چونک پڑا۔

"کیوں بھیا.... یہ مانس کون گاؤں کا رہنے والا ہے؟" بھورے نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے ان سے پوچھا۔ لیکن ان کے چہروں پر مسکراہٹ کی ایک کرن تک نمودار نہ ہوئی۔ وہ سب چپ چاپ کھڑے اپنے ساتھی کے جوش و خروش کو دیکھ رہے تھے۔

.... بھورے کی مسکراہٹ بھی سہم کر سمٹنے لگی۔

ان میں سے ایک، جو عمر میں دوسروں سے بڑا دکھائی دیتا تھا، بھورے کے قریب کھسک آیا، اور آہستہ آہستہ کہنے لگا ______

"ہم لوگ ریفیوجی ہیں بھیا ..... پر رہنے والے اسی دیس کے ہیں۔ بے گھر ہو گئے ہیں ...... ادھر پورب میں تھا ہمارا گاؤں۔ ایسا دنگا ہوا کہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ آنا پڑا ______ گاؤں کے گاؤں جلا دیئے۔ ہماری زمینیں بھی چھن گئیں ______ آتما کے بغیر خالی شریر لئے بھٹکتے پھر رہے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ نظریں اٹھا کر وہ ہل چلانے والے بوڑھے کو دیکھنے لگا ______ "کھیتوں کے بغیر یہ بڈھا جی نہ سکے گا۔ ہل، بیل، کھیت اور کھلیان اس کی رگ رگ میں بسے ہوئے ہیں۔ لائن پر روڑی پھینکتے پھینکتے وہ کھیتوں میں لہلہاتی فصلوں کو دیکھ کر رونے لگتا ہے ____ کہتا ہے، کوئی میرا سب کچھ لے لے، میری جان لے لے، پر مجھے ایک بیگھہ زمین اور ایک بیل دے دے!"

وہ چپ ہو گیا۔ بھورا بھی خاموشی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا ....

سب چپ چاپ ایک ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ ▲▲
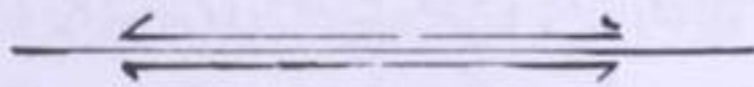
پیر گام کا ڈاک بنگلہ

اپنی تمام سنہری لچکیلی کرنیں لئے سورج مغرب میں ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے چلا گیا تو اُس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ پر سے سر اٹھالیا۔ وہ بہت دیر سے اِسی طرح بیٹھی تھی اور اب اُس کا ہاتھ درد کرنے لگا تھا۔ ہاتھ ہٹاکر اب اُس نے چوکھٹ پر اپنا گال ٹیک دیا اور دُور اُفق میں گم ہوتے ہوئے ایک پہاڑی سلسلے کو دیکھنے لگی۔

نیچے میدانوں میں اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلتا جارہا تھا۔ کٹے ہوئے پولوں اور پھوس کی گٹھریاں باندھ کر کسان گھر لوٹ رہے تھے۔ بڑی بڑی گٹھریوں میں گردن تک سر دھنسائے کھیتوں میں گذرتے ہوئے وہ یوں لگ رہے تھے جیسے عہد قبل مسیح کے بہت سے گرگٹ رینگ رہے ہوں۔ پیپل اور آم کے پیڑوں سے گھری ہوئی ایک ترائی میں تھوڑی دیر بعد مرغابیوں کا ایک غول بلند ہوجاتا اور کھلاتے ہوئے آسمان کی گود میں نقطے سے بنکر گم ہوجاتا اور پھر ایک غول اُسکی جگہ لے لیتا.... اور ہر لمحہ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں وہ سڑک بھی تحلیل ہونے لگی تھی جس کو ڈاک بنگلے تک پہونچنے سے پہلے کئی پہاڑیوں پر آٹھ دس مرتبہ چکر کاٹ کر آنا پڑتا تھا۔ کئی خطرناک موڑوں اور گہری کھائیوں سے اسے گذرنا پڑتا اور جب ایک آخری موڑ کے بعد وہ ڈاک بنگلے کے احاطے میں سُرخ سُرخ کنکریوں میں گم ہوجاتی تو ساغراک ذرا سی دیر کے لئے موٹر روک کر سڑک کے کنارے کھڑے ہوجاتے اور نیچے بل کھاتی ہوئی سڑک کے موڑوں کو دیکھنے لگتے، جیسے کوئی بہت بڑا اژدہا پہاڑیوں کے دامن سے لپٹا پڑا ہو.... اور اس وقت بھی وہ اسی سڑک کی بعض قوسوں کو دیکھنے کی کوشش کررہی تھی جو چاروں طرف سے اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں لیکن جن کا پتہ ان سے اٹھنے والی دھول کے ہلکے ہلکے بادل دے رہے تھے۔ کیونکہ اِن پر سے ابھی ابھی ایک موٹر گذری تھی۔

اور اس موٹر میں اس کی بیٹی شبو اپنے شوہر کے ساتھ جھرلاب جارہی تھی - ان دونوں کی شادی ابھی دو تین ہی دن پہلے ہوئی تھی اور آج وہ اپنی بیٹی اور داماد کو اپنے شوہر کے پاس لیجا رہی تھی، اسے دکھانے کہ اسکی لڑکی دلہن کے روپ میں کیسی لگ رہی ہے! اپنی لڑکی کی زندگی کے ہر اہم موقعہ پر وہ اسے اپنے شوہر کے پاس ضرور لیجاتی اور جھرلاب کی بستی کے باہر ویران قبرستان کے ایک کونے میں کھڑی وہ اپنے شوہر کی قبر سے جانے کیا کیا باتیں کرتی ...... اس کے انتقال کے بعد سے جیسے یہ اس کی عادت ہوگئی تھی۔

شہر سے جھرلاب جاتے ہوئے اس سے پہلے بھی وہ کئی بار اک ذرا سی دیر کے لئے بیرگام کے ڈاک بنگلے میں ٹھہری تھی، خوبصورت سبزہ پوش پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ ڈاک بنگلہ دور سے یوں لگتا جیسے درخت کی شاخوں میں گھرے ہوئے گھونسلے میں ایک انڈا رکھا ہو، اور ان انڈا جیسی اجلی دیواروں کے اندر اس نے کتنے ہی لمحات اپنے شوہر کے ساتھ گزارے تھے، جب وہ زندہ تھا اور وہ خود اپنی بیٹی شبو جیسی خوبصورت تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھی! اس کا شوہر اس علاقے میں سب سے بڑا زمیندار تھا، اور بیرگام کے ڈاک بنگلے پر اسے اپنے گھر ہی کا سا اختیار حاصل تھا ...... لیکن یہ سب گذری ہوئی باتیں تھیں، اب نہ اس کا شوہر زندہ تھا اور نہ وہ اس کا حسن! اب تو اس کے چہرے کی پیلی رنگت اور اس پر بے شمار جھریوں کو دیکھ کر کسی بہت پکے ہوئے پلپلے آم کا خیال آجاتا تھا۔ اور ان جھریوں کے جال میں اس کا پوپلا منھ یوں لگتا جیسے اس آم میں کسی نے دانت گڑو دئیے ہوں۔ اس کا سارا حسن، ساری جوانی نہ جانے کب اور کیسے چپکے ہی چپکے شبو نے چرالی تھی - اور جب وہ دلہن بنی موٹر میں اسکے برابر بیٹھی تھی تو وہ اسے دیکھ کر چونک پڑی تھی - وہ بھی کسی زمانے میں اپنے شوہر کے ساتھ اسی طرح موٹر میں جایا کرتی تھی ..... لیکن پھر اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ... خوشی کے آنسو!

—— شوہر کے انتقال کے بعد بیرگام کے ڈاک بنگلے میں جب کبھی وہ ذرا سی دیر کو ٹھہرتی تو اسے بے شمار پرانی باتیں یاد آنے لگتیں۔ بیسیوں یادیں وقت کے کھنڈروں میں سے جی اٹھتیں، اور ان سب سے گھبرا کر وہ جلد ہی وہاں سے چل دیتی۔ لیکن آج شام جب وہ ڈاک بنگلے کے سامنے لان پر بیٹھی چائے پی رہی تھی تو شبو اور واجد چائے پی کر ٹہلتے ہوئے قریب

ہی ایک ٹیلے پر بنی ہوئی لکڑی کی ایک بُرجی پر چلے گئے۔ یہ بُرجی بہت خوبصورتی سے ساگوان کی لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گول ستون اور ان پر کسی بادبانی جہاز کے عرشے کی شکل کی خوبصورت چھت چینی وضع پر بنی ہوئی تھی۔ اور اس برجی کے فوراً بعد ہی وہ پہاڑی ختم ہوجاتی تھی، وہاں سے میلوں دور نیچے کا منظر جیسے نظر میں بس کر رہ جاتا تھا۔ شبو اور واجد بھی اس منظر کے نشیب و فراز میں کھو گئے تھے۔ بُرجی کے ستونوں کے درمیان وہ خاموش کھڑے کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے، کبھی دور تک پھیلے ہوئے ڈھلانوں اور کھیتوں کو تکنے لگتے، اور کبھی بُرجی کی چھت اور ستونوں کو گھورنے لگتے ..... شام کے تھکے ماندے سورج کی کرنیں ان کو اور اس بُرجی کو اپنا سارا نُور دیکر مغربی پہاڑیوں میں سوجانا چاہتی تھیں ...... اور پھر شاہدہ نے دیکھا کہ واجد نے اپنی جیب سے قلم نکالا اور وہیں کھڑے کھڑے بُرجی کے ایک ستون پر کچھ لکھنے لگا۔ وہ لکھ چکا تو شبو نے قلم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی جگہ وہ بھی کچھ لکھنے لگی ..... اور پھر وہ وہاں سے چلے آئے۔

لیکن اِس چھوٹے سے واقعے نے شاہدہ کے دماغ میں ہلچل سی مچادی، وہ بے اختیار سی ہوکر اُٹھی اور اس بُرجی میں چلی آئی، اسکی نظریں اسی ستون پر کچھ تلاش کرنے لگیں، اور بالآخر وہ ایک جگہ جاکر رُک گئیں۔

"ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ۲۰ ر اکتوبر ۵۵ء" ————

اور اس کے نیچے شبو اور واجد کے دستخط تھے۔

اور شاہدہ اس بُرجی کی چھت اور ستونوں پر لکھے ہوئے اِسی طرح کے بے شمار فقروں میں ایک اور فقرہ تلاش کرنے لگی۔ اسے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ کہاں تلاش کرنا چاہیے ..... وہ بھی یہیں کہیں لکھا گیا تھا ..... آج سے پورے بیس سال پہلے .... یہی وقت تھا، یہی موسم! یہی ہوائیں تھیں اور ایسی ہی سرگوشیاں، لیکن وہ فقرہ اسے نہ مل سکا۔ وہ تھک گئی تھی۔ دماغی ہیجان نے اسے بہت زیادہ تھکا دیا تھا، یکے بعد دیگرے بیسیوں یادیں اس کے ذہن میں جاگتی چلی گئیں اور وہ ان میں پھنس کر بے بس سی ہوکر رہ گئی تھی، اس نے فیصلہ کرلیا وہ رات وہیں ڈاک بنگلے میں گذارے گی۔ اسے اپنی تمام یادوں، گذری باتوں کی محفل سجانی تھی ..... تنہا۔ شبو اور واجد کی موجودگی بھی اس محفل میں گوارا نہ تھی۔ یہی سوچ کر

اُس نے ان دونوں کو موٹر میں جھرلاب بھیج دیا تھا اور شوفر کو صبح واپس آنے کے لئے کہدیا تھا۔
شبو اور واجد ان باتوں سے لاعلم، چُپ چاپ جھرلاب چلے گئے، اور پیر گام کے ڈاک بنگلے کا بوڑھا چوکیدار جب شام کو چراغ روشن کرتا اس کے کمرے میں آیا تو اسے بھی اپنی بوڑھی مالکن کے چہرے پر کچھ عجیب سے رنگ جھلکتے نظر آئے۔ چوکیدار چلا گیا تو شاہدہ نے پھر ایکبار اس کھڑکی میں سے پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے اور ان اندھیروں میں گم ہوتی ہوئی سڑک کی قوسوں کو دیکھنے کی کوشش کی جن کا پتہ دھول کے ہلکے ہلکے بادل دے رہے تھے، یہ بادل ابھی ابھی اس سڑک پر سے ایک موٹر کے گذرنے سے پیدا ہوئے تھے، اور اس موٹر میں شبو اور واجد جھرلاب جا رہے تھے۔

اور اب اسکی یادوں کی محفل آراستہ ہوتی جارہی تھی ______ اسی سڑک سے ایسی ہی موٹر میں ایک دن وہ اپنے شوہر حمید کے ساتھ پاس کے ایک گاؤں جارہی تھی، وہاں کوئی میلہ لگا ہوا تھا۔ حمید اسے بے حد اصرار کر کے ساتھ لئے جارہا تھا۔ وہ اُسے بے انتہا چاہتا تھا، اور شاہدہ خود بھی اسکی دیوانی تھی، اِن دونوں کی محبت گاؤں بھر میں مثال بن گئی تھی ......
جب میلے والا گاؤں تھوڑی دور رہ گیا تو حمید نے ایک جگہ موٹر چھوڑ دی، وہ اپنے ساتھ کچھ عجیب سے کپڑے لایا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہاں کے گاؤں کے لوگ عام طور پر پہنا کرتے تھے، وہ چاہتا تھا اِنہیں میلے میں کوئی پہچان نہ سکے اور وہ بھی گاؤں کے عام لوگوں کی طرح خوب جی بھر کر گھومیں پھریں اور لُطف اُٹھائیں۔

اور جب وہ اِس لباس میں میلے میں گھومنے لگے تو واقعی کوئی اُن کو پہچان نہ سکا. حمید اُس لباس میں گاؤں کا ایک سجیلا جوان لگ رہا تھا۔ چوڑا سینہ، بکھرے بال، مضبوط اور لمبے لمبے ہاتھ پیر، اور اس کے برابر ہی پیلی اور گلابی اوڑھنی اور سُرخ ڈھیلے ڈھالے لہنگے میں، کہنیوں تک چوڑیاں پہنے، شاہدہ گاؤں کی ایک شرمیلی، نئی نویلی دلہن معلوم ہو رہی تھی، وہ دونوں اس دن بہت خوش تھے ! دن بھر اِدھر اُدھر گھومتے رہے، لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھے کا تماشہ دیکھا، گنّے، بیر اور مونگ پھلیاں کھائیں، مداری کے کرتب اور سینڈو کے کھیل دیکھے، اور آخر میں میلے کے فوٹو گرافر کی دوکان پر جا کر دونوں نے ایک تصویر کھنچوائی۔ پیچھے ایک بڑا پردہ تھا جس پر پہاڑوں

اور ندی کی تصویروں کے ساتھ ایک محل اور بارہ سنگے کی تصویریں بھی بنائی گئی تھیں، اس کے سامنے حمید ایک ٹین کی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔ پشت پر ایک عمدہ سالٹھ نکالیا اور سامنے پیروں کے قریب، سکڑی سکڑائی شاہدہ گھونگھٹ نکالے بیٹھ گئی ______

وہ دن اُن کی زندگی کا سب سے عجیب اور پیارا دن تھا، وہ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے ایک دوسرے سے اسی دن میلے میں ملے ہوں۔ جیسے اس سے پہلے وہ ایک دوسرے سے واقف تک نہ تھے ...... اور پھر میلے میں ہی ان کی دوستی، ان کی محبت، ان کا والہانہ عشق شروع ہوا ہو ...... ایک نئی مسرت ایک نئے سرور میں وہ کھو سے گئے تھے، اور جب رات کی تاریکی چپکے چپکے میدانوں اور کھیتوں میں پھیلنے لگی تو وہ واپس ہو گئے۔

واپسی میں انہوں نے طے کیا کہ رات پیرگام کے ڈاک بنگلے میں ہی گذاری جائے اور دوسرے دن صبح اپنے گاؤں جھرلاب چلے جائیں۔

چوکیدار نے رات کا کھانا پکا دیا۔ اور کھانا کھا کر وہ باہر دالان میں آ بیٹھے۔ ہوا میں جنگلی پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اور اس خوشبو میں ایک عجیب نشہ کی سی کیفیت گھلی ہوئی تھی، حمید سگار پی چکا تو دونوں اُٹھ کر اندر جانے لگے کیونکہ اب ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی ..... مگر اسی لمحہ حمید چکرا کر نیچے فرش پر گر گیا، بے ہوش، بے حس و حرکت، شاہدہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، چوکیدار کی مدد سے حمید کو اندر پلنگ پر لٹایا ...... کچھ دیر بعد اُسے ہوش آیا مگر فوراً ہی قے ہوگئی ..... اور اس کے ساتھ ہی تیز بخار چڑھ گیا۔ اور پھر اس کی حالت بگڑتی چلی گئی، اور بخار اتنا تیز ہو گیا کہ وہ بے سُدھ سا ہو کر پڑ گیا۔ چوکیدار نے بتایا کہ جس گاؤں سے وہ آئے تھے وہاں میلے میں ہیضہ پھوٹ پڑا تھا، اور شاید ..... شاید حمید بھی اسی کا شکار ہو گیا تھا۔ شاہدہ پاگل سی ہو گئی! ...... یہ سب کیا ہو گیا؟ اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے! موٹر موجود تھی لیکن چلانے والا نہ تھا، آس پاس کوئی ایک مکان تک نہ تھا ..... وہ روتی، چیختی، چلاتی اور پھر چُپ چاپ حمید کے سینے میں منھ چھپا لیتی، لیکن حمید کی حالت اور خراب ہوتی جا رہی تھی، اور جب اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہونے لگے تو اسکی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ڈاک بنگلے کے باہر دوڑنے لگی ...... دالان، صحن اور پھر

احاطہ کے باہر تک وہ دوڑتی چلی گئی۔ اس خوفناک تنہا رات میں اسے ذرا بھی ڈر نہ لگا۔ اور پھر ایک بڑے سے پتھر پر چڑھ کر وہ نیچے بیسیوں فٹ گہرے گھڈ میں کودنے لگی ......
لیکن پھر کسی ان جانے جذبے کے تحت وہ رُک گئی، چند لمحے خاموش کھڑی رہی، اور پھر زور زور سے روتے ہوئے وہ اوندھے مُنھ اس پتھر پر لیٹ گئی۔ اس کے آنسو پتھر میں جذب ہوتے چلے گئے .... اور جب روتے روتے تھک گئی تو آہستہ سے دو زانو ہو بیٹھی، وہ سامنے تاریکیوں میں گھور رہی تھی .... گھورتی چلی گئی، جیسے وہاں اسے کوئی عظیم طاقت کوئی غیر انسانی قوت نظر آ رہی ہو ..... اس کی بے پناہ محبت امید کا روپ دھارے اس کے سامنے کھڑی ہو، اور وہ اس سے اپنے دل کی تمام باتیں کہتی چلی گئی .... باتیں جو حمید کے لئے تھیں، اس کی زندگی، اس کی محبت کے لئے تھیں، اور ان باتوں نے اس کا ذہن، اس کا فہم سبھی کچھ جذب کر لیا تھا، جانے کب تک اسی طرح گم سم بیٹھی رہی ———

اور پھر صبح ہو گئی، ہلکے ہلکے ملگجے اُجالے میں اسے ڈاک بنگلے کی سفید عمارت نظر آ رہی تھی، وہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ اندر داخل ہو گئی، وہ حمید کے کمرے میں گئی، وہاں پلنگ پر کمبل اوڑھے وہ خاموش پڑا تھا، شاہدہ نے اس کا ہاتھ چھوا، اور پھر پیشانی، چہرہ اور گردن پر باری باری ہاتھ پھیر پھیر کر یقین کرنا چاہا کہ وہ واقعی زندہ تھا! ..... اس کا حمید زندہ تھا وہ اس سے لپٹ گئی۔ دفورِ جذبات سے اسکی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ... اسے یقین ہو گیا اب حمید نہیں مر سکتا۔
... وہ دن بھر اسی طرح تیز بخار میں بیہوش پڑا رہا مگر اس کی حالت سنبھلتی گئی، چوکیدار جا کر قریب کے گاؤں سے کچھ دوائیں لے آیا تھا، دوسرے دن صبح حمید کو ہوش آ گیا، اور شام کو اس کا بخار اترنے لگا، ..... اور تیسرے دن وہ بالکل ٹھیک ہو گیا ...... شام کی چائے پی کر واپس چھرا ب جانے سے پہلے وہ دونوں ٹہلتے ہوئے اسی لکڑی کی بُرجی کے پاس چلے گئے تھے ..... وہاں اس کی چھت اور ستونوں پر اُنھیں بیسیوں جملے، سیاہی، پنسل اور کوئلوں سے لکھے ہوئے نظر آئے، شاید اِن سے پہلے جتنے مسافر، سیاح وہاں آئے تھے، اس برجی پر کچھ لکھ گئے تھے ....

حمید چُپ کھڑا ان جملوں کو دیکھ رہا تھا، کبھی کبھی وہ شاہدہ کو دیکھ لیتا، لیکن وہ بالکل

خاموش تھا، اس کے پیر کانپ رہے تھے، سانس پھول سا گیا تھا .... شاید یہ اسکی بیماری کے بعد کی کمزوری کا نتیجہ تھا .... یا شاید وہ دل میں مچے ہوئے طوفان سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے کوٹ کی جیب سے ایک پنسل نکالی اور ایک ستون کے پاس نکلے ہوئے چھت کے "چھجے" پر کچھ لکھنے لگا .... اس کا ہاتھ، انگلیاں، اور انگلیوں میں دبی ہوئی پنسل، سب کانپ رہے تھے .... وہ لکھ رہا تھا۔

"آج ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو شاہدہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے ____ حمید"

اور پھر وہ جھرلاب واپس چلے گئے تھے .... اس کے ایک برس بعد جب شبو پیدا ہوئی تو حمید کا انتقال ہو گیا۔ اسے نمونیہ ہو گیا تھا، شاہدہ اب کی بار اسے نہ بچا سکی، لیکن جاتے جاتے وہ شبو کو اس کے پاس چھوڑ گیا تھا .... اور اب شبو ہی اس کے لئے حمید بن گئی تھی۔

وہ شبو کی ذرا ذرا سی بات حمید کو سنانے اسکی قبر پر جاتی اور ایسے بیان کرتی جیسے وہ سچ مچ منوں مٹی کے نیچے پڑا اسکی ساری باتیں سن رہا ہو۔ اس نے شبو کو بی، اے پاس کرایا۔ اور جب واجد سے اس کی شادی ہو گئی تو شاہدہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی، کیونکہ اسے معلوم تھا واجد شبو کو بے حد چاہتا ہے، اور ان کی شادی کے موقع پر واجد اور شبو کو حمید کے حضور میں پیش کرنے کی غرض سے جب وہ شہر سے جھرلاب جا رہی تھی تو پیرگام کے ڈاک بنگلے میں اسی پرانی چوبی برجی میں واجد اور شبو کو، ویسے ہی ایک ستون پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھ کر اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان سا جاگ اٹھا تھا ____

اس رات بڑی دیر تک وہ انہی یادوں میں گم رہی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ واجد اور شبو کو کیا معلوم کہ انہی ستونوں میں سے کسی پر اس کے حمید نے بھی کچھ لکھا تھا، ایسا ہی موسم تھا، یہی ہوائیں اور یہی پہاڑ اور جنگل جب بھی تھے، اسکی آنکھوں میں وہی جملہ گھومنے لگا ...... "آج ۲۰ مارچ ۳۵ء کو شاہدہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے ____ حمید"! اور پھر اسے شبو اور واجد کے ناموں کے ساتھ ایک اور جملہ ابھرتا دکھائی دیا .... "ہم کبھی جدا نہ ہوں گے"۔

اور وہ سوچنے لگی شاید ان کے بعد ان کی اولاد میں سے کوئی اور بھی ایسے ہی کسی خوشی کے موقع پر اس ڈاک بنگلے پر سے گزرے اور اس بُرجی میں ایسا ہی کوئی جملہ لکھ جائے ..... کسے معلوم ! اور ابھی جانے ایسے کتنے جملے یہاں لکھے جائیں گے، لیکن ..... لیکن وہ سوچنے لگی ..... کسی میں بھی وہ صداقت، وہ محبت، وہ پاکیزگی نہ ہوگی جو اس کے حمید کے لکھے ہوئے جملہ میں تھی۔

اور " ہم کبھی جدا نہ ہوں گے " کا عہد کرنے پر بھی جب ان میں سے کسی کو دوسرے سے بچھڑ جانا پڑے گا تو وہ بھی یہاں آکر یہی سوچے گا کہ جو خلوص اور صداقت " ہم کبھی جدا نہ ہوں گے " میں ہے وہ اور کسی جملے میں نہیں ...... اور یہ چکر یونہی چلتا رہے گا۔ یہ بُرجی یونہی رہے گی، بیرگام کا ڈاک بنگلہ یونہی رہے گا۔ ▲▲

ڈاکٹر احسان

رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ ہوا میں خنکی ناقابل برداشت ہو چلی تھی۔ مگر پرسی کے ڈانس فلور کی رونق میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ ایر فورس کا بینڈ اب بھی انگریزی نغمے فضا میں بکھیر رہا تھا اور اس کی لے پر مردوں کے ساتھ ناچتی ہوئی عورتوں کے رنگین لباس اب بھی ہوا میں تتلیاں سی اڑا رہے تھے۔ ہلکے ہلکے قہقہوں کے ساتھ بوتلوں کے کاگ اڑنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ پہلا سا جوش اب کم پڑ گیا تھا۔ بینڈ سے نکلنے والے سُر تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ ڈانس فلور پر ناچتے ہوئے جوڑے ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے تھے اور اکثر عورتوں کے لبوں پر لپ اسٹک کی شوخی پھیکی پڑ گئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں ایوننگ ان پیرس اور سیون موتس کی بجائے رم اور وہسکی گھل چکی تھی۔ میں اور اصغر تازہ ہوا کی تلاش میں ہنگامہ سے ہٹ کر ایک خالی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ یہاں سے کھلے آسمان کے پس منظر میں ناریل کے درخت اور ان کے چکنے پتوں پر ہلکی ہلکی چاندنی کا عکس بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ ڈھلتے چاند کی زرد۔ بے جان ٹکیہ ہواؤں کے جھونکوں میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ میں گردن اٹھائے اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"وہاں کیا دیکھ رہے ہو؟" اصغر نے گلاس کے پیندے میں پڑے ہوئے وہسکی کے آخری قطرے حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ "اس پھیکے بے جان چاند میں کیا رکھا ہے! ادھر دیکھو ...... ان زندہ چاندوں کو۔ ان کی دودھ میں دھلی چاندنی کی کرنیں کتنی نرم اور نازک ہیں ...... کتنی حیات بخش!" اور اس نے اپنی نظریں اس اینگلو انڈین

لڑکی کے برہنہ شانوں پر گاڑ دیں جو پچھلے ڈانس میں اس کی پارٹنر تھی۔ اور اب کسی اور کے ساتھ ناچ رہی تھی۔

"کم بخت جتنی خوبصورت ہے اتنا ہی اچھا ناچتی بھی ہے۔" میں نے اصغر کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ اس لڑکی پر بری طرح مٹا ہوا ہے۔ اصغر نے چپ چاپ جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ سلگا لیا۔

"جانتے ہو کس کے ساتھ ناچ رہی ہے؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔ مگر میں اس کے پارٹنر کو نہیں جانتا تھا۔ وہ کوئی تیس پینتیس برس کی عمر کا صحت مند شخص تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر ہلکے سیاہ شیشوں والی عینک بڑی کھپ رہی تھی۔ "وہ ڈاکٹر احسان ہے۔" اصغر نے خود ہی بتایا "شہر کا مشہور ڈاکٹر۔ لوگ کہتے ہیں اس کے ہاتھ میں شفا ہے...... جادو ہے! خاک ہے...... مجھے تو اس کے ہاتھ میں کوئی اور ہی جادو نظر آتا ہے۔ دیکھو تو وہ کم بخت لونڈیا کیسی جھک رہی ہے اس کے ساتھ!"

ڈاکٹر احسان کے بارے میں میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس کے متعلق لوگ مختلف رائیں رکھتے تھے...... بڑا ماہر اور ہوشیار ڈاکٹر ہے...... غریبوں کا بے حد ہمدرد ہے'...... بڑا لالچی ہے' ٹٹ پونجیا ہے' موڈی ہے...... ڈانس ریس اور جوئے میں وقت گنواتا پھرتا ہے......! مجھے اس سے ملنے کی عرصہ سے خواہش تھی۔

"کیا تم جانتے ہو اس کو؟" میں نے پوچھا

"بہت اچھی طرح" اصغر بولا "ملنا چاہتے ہو؟"

ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ ڈانس ختم ہونے پر اصغر اٹھ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کو لیے واپس آ گیا۔ اس کی ہاتھ میں وہسکی کا ایک اور گلاس تھا۔

"ان سے ملو ڈاکٹر...... شہر کے مشہور انجینئر آصف...... تم سے ملنے کے بہت خواہشمند تھے!" اصغر نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے" میں نے سلسلہ گفتگو آغاز کرنے کے لئے کہدیا۔

"صرف تعریف ہی سنی ہے! ..... برائی نہیں سنی؟" ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ بھی سنی ہے" اور میں بھی ہنس پڑا۔ بات کا رُخ بدلتے ہوئے میں نے پوچھا

کیا پیجیے گا؟"

"اب کچھ بھی نہیں" ڈاکٹر نے کہا "میں بہت تھوڑی پیتا ہوں۔ اپنا کوٹا پورا کرلیا ہے ..... اب اور نہیں!"

دوسرا ڈانس شروع ہوچکا تھا۔ ڈاکٹر کچھ دیر تک ناچتے ہوئے جوڑوں کو دیکھتے رہے پھر ہولے ہولے کہنے لگے۔

"لوگ کیا جانیں میں یہاں کیوں آتا ہوں! ...... مسلسل بیمار، اپاہج اور تڑپتے ہوئے انسانوں کے ساتھ رہتے رہتے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے دنیا سے صحت تندرستی، خوشیاں اور قہقہے بالکل ختم ہوگئے ہیں۔ اس ہولناک ماحول کے تصور ہی سے جی کانپ جاتا ہے ..... ایسے میں یہاں آکر پھر ایک بار دنیا خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔ جینے کی امنگ جیسے جاگ اٹھتی ہے ...... حسن، شباب اور صحت کے نظاروں سے اپنی نگاہوں کے ویرانے پھر سے آباد کرلیتا ہوں ......" کہتے کہتے وہ اچانک رک گئے۔ پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور کھڑے ہوگئے۔ "معاف کیجئے۔ اب مجھے نیند آرہی ہے ...... پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔" اور وہ باہر کے دروازے کی طرف مڑ گئے۔

ان کے جانے کے بعد اصغر بولا۔

"سب بکواس ہے ..... جھوٹ بکتا ہے۔ یہاں آتا ہے ان لونڈیوں کی خاطر۔" اور گلاس منہ سے لگا کر غٹاغٹ خالی کردیا۔

ڈاکٹر احسان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات میں ان کے بارے میں کوئی اچھی رائے قایم نہ کرسکا۔

کچھ ہی دن بعد مجھے ایک سرکاری کام سے بمبئی جانا پڑا۔ واپس آتے وقت ٹرین میں ڈاکٹر احسان سے پھر ملاقات ہوگئی وہ بھی بمبئی سے آرہے تھے۔ ہم ساتھ ایک ہی

ڈبے میں بیٹھے تھے۔ رسمی سلام علیک کے بعد کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے متوازن چہرے کے خدوخال اس دن کچھ اترے اترے، کھچے کھچے سے نظر آ رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکایک خاموش ہو جاتے جیسے کسی سوچ میں غرق ہو گئے ہوں۔ پھر چونک کر گفتگو کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کرنے لگتے۔ رات کا کھانا ہم نے ساتھ ہی کھایا۔ کھانا کھاتے وقت انہوں نے اپنی سیاہ شیشوں والی عینک اتار کر رکھ دی تھی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک عجیب بے چینی، اداسی سی جھلکتی نظر آئی۔ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ "آپ بہت غمگین، کھوئے کھوئے سے نظر آ رہے ہیں۔ بات کیا ہے، پوچھ سکتا ہوں؟"

"سن کر شاید آپ ہنسیں گے .... یہ میری ایک کمزوری ہے۔ بے وقوفی ہے" اور ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک پھیکی، بے کیف مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر یوں بول رہے تھے۔ جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔

"میں اپنے مریضوں کا علاج پوری توجہ اور محنت سے کرتا ہوں۔ اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا .... تمام تدبیروں کے باوجود بعض اچھے نہیں ہو پاتے۔ میں جانتا ہوں ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ پھر بھی .... پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی موت کا ذمہ دار میں ہوں! میں خطاوار ہوں، مجرم ہوں .... شاید مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو، کوئی کمی رہ گئی ہو! .... اور یہ احساس مجھ پر بری طرح چھا جاتا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگتی ہے .... بمبئی میں میرے ایک پرانے دوست رہتے ہیں۔ ان کے والد سخت بیمار ہو گئے تھے۔ فالج کا کیس تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا تھا علاج کے لیے .... انہیں اپنے والد سے بہت محبت تھی، ان کا خیال تھا میں انہیں بچا لوں گا ——— مگر میں بچا نہ سکا ...." تھوڑی دیر چپ رہ کر کہنے لگے "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں مجھے ڈاکٹر نہ بننا چاہیے تھا!"

اس کے بعد دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ میں سوچ رہا تھا ڈاکٹر کی شخصیت کتنی عجیب اور دلچسپ ہے۔ رات زیادہ ہو گئی تو ہم سونے کی تیاری کرنے لگے۔ میں اوپر برتھ پر

بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ سفر میں میں بہت کم سوتا ہوں۔ بڑی کوشش کے بعد نیند آئی مگر جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ ہاتھ پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا تو ڈھائی بجے تھے۔ صبح ہونے میں بہت دیر تھی۔ کروٹ بدل کر پھر سونا چاہا۔ برابر میں ڈاکٹر کی برتھ پر نظر پڑی۔ بستر بچھا تھا۔ مگر ڈاکٹر کا پتہ نہ تھا۔ جھک کر نیچے دیکھا تو ڈاکٹر کھڑکی کھولے تاریک آسمان میں رینگتے ہوئے تاروں کو گھور رہے تھے۔

"کیا نیند نہیں آئی ڈاکٹر؟" میں نے وہیں سے پوچھا۔

"نہیں" مختصر سا جواب تھا۔

"کوشش تو کی ہوتی۔" میں نے کہا۔

"کوشش بیکار ہے...... ہاتھ میں درد بڑھ گیا ہے۔"

"ہاتھ میں درد!...... یہ کب سے ہو رہا ہے؟"

"ابھی ہوا ہے" اور وہ کھڑکی سے ہٹ کر میری طرف مڑ گئے "یہ درد بچپن سے ہے...... ہمیشہ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی رات کو یکایک شروع ہو جاتا ہے۔" اور پھر وہی پھیکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ علاج نہیں کیا اس کا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا تھا۔ کئی بار۔ خود بھی کیا اور دوسرے ماہرین سے بھی کرایا...... مگر سب بیکار۔"

"کہاں ہوتا ہے یہ درد؟" میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"یہاں کہنی کے جوڑ میں" دایاں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے انہوں نے بتایا۔ "دراصل یہ ایک چوٹ کا نتیجہ ہے جو بچپن میں آئی تھی...... میں اس وقت کھڑکی کے پاس بیٹھا اس چوٹ کے واقعہ کو یاد کر رہا تھا۔ نیند نہ آ رہی ہو تو نیچے آ جائیے...... جی چاہ رہا ہے اپنی بے وقوفی کی داستان آپ کو بھی سنا دوں......!"

میں نیچے اتر آیا تو انہوں نے کہنا شروع کیا "میں ان دنوں اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جماعت میں ہمیشہ اول آتا تھا اس لیے سارے ساتھی مجھ سے جلتے تھے۔

میں ان کی شرارتوں میں شریک نہ ہوتا تھا۔ کسی کو دُکھ پہنچانا یا ستانا مجھ سے کبھی برداشت نہ ہوا۔ ..... ایک دن بہت زور کا طوفان آیا، خوب بارش ہوئی۔ ہمارے اسکول کے سامنے سڑک کے کنارے ایک بڑا نیم کا درخت تھا۔ ایک ننھا سا چڑیا کا بچہ اس پر سے نیچے گر کر بُری طرح چیخ رہا تھا۔ بہت سے بچے اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ ستا ستا کر خوش ہو رہے تھے۔ مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ بچے کو لیکر درخت پر چڑھ گیا کہ واپس گھونسلے میں رکھ دوں گا۔ مگر گھونسلہ بہت اوپر تھا۔ میں ڈر گیا کہیں گر نہ پڑوں۔ نیچے میرے ساتھی مجھ پر ہنس رہے تھے، میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ اوپر گھونسلے میں بچے کے ماں باپ مجھے چیخ چیخ کر بلا رہے تھے۔ بڑے تامل کے بعد میں نے گھونسلے تک جانے کا فیصلہ کر لیا! مگر کچھ ہی دور گیا تھا کہ پیر پھسل گیا .... اسکے بعد جب ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں بستر پر پڑا تھا۔ اور اس کہنی پر پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ چڑیا کا بچہ میرے ساتھ گر کر مر گیا تھا....

... مجھے یاد ہے اس کی موت کے غم میں اپنا درد بھی بھول گیا تھا ....!"

ریل کسی پُل پر سے گذر رہی تھی اور اس کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور زیادہ خوفناک ہو گئی تھی۔ کچھ دیر چپ رہ کر اپنے ہاتھ کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "ہڈی جُڑ گئی مگر اب بھی کبھی کبھی یکایک درد شروع ہو جاتا ہے .... جانے کہاں سے اٹھ کر وہ سارا واقعہ پھر ذہن میں گھومنے لگتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں جیسے میں اس درخت کے نیچے بے ہوش پڑا ہوں۔ اور .... اور میرے پاس ہی اس ننھے سے چڑیا کے بچے کی لاش پڑی ہے .....!" ڈاکٹر کے چہرے پر ایک طویل مسکراہٹ پھیل گئی "کیسی بچوں کی سی بات ہے۔ ہے نا؟"

"ہے تو سہی .... مگر آپ نے ڈاکٹر بن کر واقعی غلطی کی۔" مجھے ہنسی نہ آسکی۔

ڈاکٹر احسان سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات کے بعد مجھے یوں لگا جیسے شہر کا مشہور ڈاکٹر اندر سے محض ایک بچہ ہے .... ایک معصوم، حساس اور جذباتی بچہ!

اس کے بعد ہماری ملاقاتیں زیادہ ہوتی گئیں ۔ دوستی بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئی ۔ شام کا وقت ہم اکثر ساتھ ہی گزارتے ۔ وہ میرے پاس چلے آتے یا میں اُن کے یہاں پہنچ جاتا ۔

ایک چھوٹے سے خوبصورت بنگلے میں وہ تنہا اپنی ماں کے ساتھ رہتے تھے ۔ دواخانے کے وقت کے بعد خاص صورتوں میں مریضوں کو گھر پر بھی دیکھ لیا کرتے تھے ۔ جب کبھی فرصت ہوتی ہم کلب یا سنیما چلے جاتے ۔ کبھی کبھی ڈانس پارٹیوں میں ساتھ ہی جاتے .... اسی زمانے میں مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر احسان اپنے مریضوں کا علاج واقعی بڑی محنت سے کرتے ہیں ۔ نوابوں اور جاگیرداروں سے بھاری بھاری رقمیں وصول کرنے میں دریغ نہیں کرتے مگر ساتھ ہی غریبوں کا علاج اکثر مفت کر دیا کرتے ہیں ۔ بلکہ بعض اوقات قیمتی دوائیں اپنے پاس سے ان کو دیتے ...... ! یہ سبھی کچھ تھا مگر اس وقت بڑی مشکل آ پڑتی جب ان کا کوئی مریض مر جاتا ! وہ بے حد اداس اور فکر مند ہو جاتے جیسے واقعی ان ہی کی بھول سے اس کی جان گئی ہو ! یہ احساس ان پر کئی کئی دن تک چھایا رہتا ۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے ان سے پوچھا تھا ۔

"ڈاکٹر ۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتے ؟ .... کیا زندگی میں کسی رومان کا انتظار ہے ؟" اور ڈاکٹر نے جواب دیا تھا "بغیر رومان کے شادی کا میں قائل نہیں ہوں .... یوں چھوٹے موٹے رومان تو کئی ہو چکے ہیں ...... مگر زندگی کے اصل پارٹنر کا ابھی تک انتظار ہے ۔" اور اس کے بعد وہ بڑی دیر تک نہ جانے کن سے تصورات میں کھوئے رہے !

ایک دن شام کے وقت میں ڈاکٹر احسان کے یہاں بیٹھا تھا ۔ ہم کہیں باہر جانے کا پروگرام سوچ رہے تھے کہ نوکر نے آکر اطلاع دی کوئی غریب بڑھیا ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہے ۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد اسے بلا لیا گیا ۔ بڑھیا کے ساتھ کوئی بیس یا بائیس برس کی ایک لڑکی بھی تھی ۔ سانولے سے رنگ کی ، بہت ہی معمولی ناک نقشے کی ...... سوکھے سوکھے ہاتھ پیر جن کی رگیں اُبھری ہوئی ، گرد میں اَٹے ہوئے سوکھے بال ۔ چہرے سے کرب کے آثار نمایاں ، بڑھیا نے گڑگڑا کر کہا ۔

"یہ میری بیٹی ہے ۔ میرے بڑھاپے اور دکھوں کا سہارا ! اسے سر کے درد کے

سخت دورے پڑتے ہیں۔ بے ہوش ہو ہو جاتی ہے! ڈاکٹر صاحب اس کو اس مصیبت سے نجات دلائیے .... میں مرتے دم تک آپ کے لیے دعائیں مانگتی رہوں گی۔ اس کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں! آپ کی اتنی تعریف سن کر اسے لائی ہوں .... خدا کے لیے اُسے اچھا کر دیجئے ـــــــ" اور اس کا گلا بھرا گیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اسے رونے سے منع کر کے ڈاکٹر نے لڑکی کو دیکھا۔

"اس کی شادی ہو چکی ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ منگنی ہوئی تھی .... مگر اب لڑکا کہتا ہے جب تک اچھی نہ ہو جائے شادی نہیں کروں گا"۔ بڑھیا نے ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ کل صبح کلینک لے آنا۔ علاج شروع کر دوں گا"۔ احسان نے کہا۔ اور ہم لوگ باہر چلے گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اس کے کوئی ایک مہینے بعد ڈاکٹر احسان ایک دن میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، بڑے پریشان، مغموم سے ....! میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

"اس بڑھیا کی لڑکی والا کیس یاد ہے؟ .... جس کو دردِ سر کے دورے پڑا کرتے تھے!"

"ہاں یاد ہے ...." میں نے کہا "کیا ہوا اسے؟"

"اس کی بیماری کا ٹھیک علاج ابھی تک دنیا میں کسی کو نہیں معلوم! .... تاہم میں کوشش کر رہا ہوں۔ مختلف تدبیریں کیں، نئے نئے تجربے کئے .... اس کے سر کا درد تو جاتا رہا مگر ایک نئی چیز پیدا ہو گئی .... اس کی بصارت کم ہوتی جا رہی ہے!"

"یہ کیسے ممکن ہے!" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہی تو میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بڑا پیچیدہ کیس بن گیا ہے۔ میں نے بعض نئی دوائیں بھی استعمال کی تھیں، شائد ان ہی کے اثر سے دماغ کی بعض رگیں بے کار ہو گئی ہیں .... کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے!"

ڈاکٹر کے چہرے پر سخت کرب کے آثار پھیلتے جا رہے تھے۔

"دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ لیا؟" میں نے پوچھا۔

"کسی کی سمجھ میں نہ آسکا کیا وجہ ہے!" اور اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ جاتے وقت انہوں نے بتایا کہ بڑھیا اور اس کی لڑکی کو انہوں نے اپنے ہی گھر کے ایک علیٰحدہ کمرے میں ٹھہرنے کو کہدیا ہے بہاں کہ وہ زیادہ باقاعدگی اور احتیاط سے علاج کرسکیں گے۔

اس کے کوئی ہفتہ بھر بعد میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ڈاکٹر کا فون آیا "فوراً چلے آؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے"۔

جب میں ان کے گھر پہنچا تو وہ کمرے میں بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ مجھے ایک کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا مگر خود ٹہلتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے آ بیٹھے۔

"میں پاگل ہو جاؤں گا ...... مجھ سے یہ برداشت نہیں کیا جاتا! ...... بتاؤ ...... بتاؤ میں کیا کروں؟" ڈاکٹر کی حالت قابلِ رحم تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیں گے۔

"کیا ہوا ...... کچھ بتاؤ تو سہی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میری آخری کوشش تھی۔ آج تین دن بعد اس کی آنکھوں کی پٹیاں کھولی گئیں۔ مگر ...... مگر جانتے ہو کیا ہوا؟ وہ ...... وہ اب اندھی ہے۔ بالکل اندھی! اب وہ کبھی دیکھ نہ سکے گی ...... میں نے اُسے اندھا کر دیا۔ میں نے ......!"

"مگر اس میں تمہارا کیا قصور ڈاکٹر! ...... تم نے تو اسے اچھا کرنے کی پوری کوشش کی تھی"۔ میں نے کہا۔

"پھر وہی بات!" وہ جھلا اٹھے۔ "مجھے تسلی دینے کی ضرورت نہیں ...... میں نے کہا تھا نا یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔" اور وہ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ "جانتے ہو جاتے وقت اس کی ماں نے کیا کہا؟ ...... کہنے لگی اس سے تو اچھا ہوتا میری بیٹی مرجاتی ...... موت آجاتی اسے۔ اب کہاں دربدر ٹھوکریں کھاتی پھرے گی! ...... کون پوچھے گا اس اندھی کو؟" اور وہ میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ "تم نے اس کی لڑکی کی وہ بے نور آنکھیں نہیں دیکھیں ...... اوہ! معلوم ہوتا ہے جیسے اب

وہ ساری زندگی میرا تعاقب کرتی رہیں گی۔۔۔۔۔"

"تم بہت جذباتی ہو گئے ہو ڈاکٹر۔۔۔۔۔ ذرا سنجیدگی سے سوچو۔۔۔۔۔" میں نے سمجھانا چاہا مگر وہ درمیان ہی میں بول پڑے۔

"میں نے تمہیں لیکچر دینے نہیں بلایا ہے۔۔۔۔۔ مجھے کوئی راستہ سمجھاؤ۔ میری مدد کرو۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔ اوہ۔ نہ معلوم میں کیا کروں گا!"

"کسی پر رحم کھانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا ڈاکٹر کہ اپنی یہ حالت بنا لو۔" میں نے کہا۔

"رحم؟ ——— ہاں۔ مجھے اس پر بے حد رحم آرہا ہے۔ مگر اس سے زیادہ میں اپنے لیے پریشان ہوں۔ میں اس کے لیے نہیں، اپنے لیے سوچ رہا ہوں۔ مجھے کیسے سکون آئے گا! کیسے معاف کرسکوں گا اپنے آپ کو؟۔۔۔۔۔ کیا تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا؟"

جواب دینے کی بجائے میں ڈاکٹر کو اپنے گھر لے آیا۔ مختلف طریقوں سے ان کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہم نے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر باہر گھومنے نکل گئے۔ شام کو بھی دیر تک میں ان کے ساتھ رہا۔ اور رات کو دیر گئے جب میں انہیں گھر پر واپس چھوڑنے گیا تو مجھے محسوس ہوا جیسے ان کے ذہن میں مچا ہوا وہ طوفان آہستہ آہستہ تحلیل ہو چکا ہے۔

"کل صبح جب سو کر اٹھو گے تو تمہیں اپنی بے وقوفیوں پر ہنسی آئے گی" جلتے جاتے میں نے ہنستے ہوئے کہا اور واپس چلا آیا۔

دوسرے دن شام کو جب دفتر سے گھر پہنچا تو نوکر نے ایک بند لفافہ لاکر دیا جو ڈاکٹر کا نوکر تھوڑی دیر پہلے دے گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کھول کر پڑھنا شروع کیا:

"تمہاری ساری کوششوں کے باوجود میں کل رات بھر نہ سو سکا۔ ساری رات سوچتا رہا۔۔۔۔۔ اور آج صبح میں نے اپنی نجات کا راستہ تلاش کر لیا ہے! میں نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔۔۔ ہاں شادی! تمہیں جب یہ خط ملے گا، ہماری شادی ہو چکی ہوگی۔ اور ہم کسی

لمبے سفر پر "ہنی مون" منانے روانہ ہو چکے ہوں گے ...... تمہیں تعجب تو ضرور ہو گا مگر میرے لیے اس کے سواء اور کوئی راستہ نہ تھا۔ شائد یہی وہ لڑکی ہو جس کا میری زندگی کو مدت سے انتظار تھا! میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا سکھادوں گا۔ اور کون جانے شائد اسی بہانے زندگی میں چپکے چپکے رومان آداخل ہو! ______ ماں کو سب معلوم ہو چکا ہے۔ واپس آنے تک ان کی خبر رکھنا۔ افسوس کہ شادی میں تم شریک نہ ہو سکے۔ تم نے میری ہمدردی میں جو کچھ کیا ہے اسے میں کبھی بھول نہ سکوں گا۔ کچھ عرصے کے لیے خدا حافظ۔

تمہارا

احسان
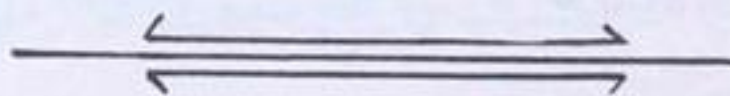
شام سے پہلے

ڈاکخانے کے موڑ پر اخبار والے کی دکان سے ایک انگریزی اخبار خرید کر میں وہیں کھڑے کھڑے پڑھ رہا تھا۔ در اصل اخبار پڑھنے کا میں صرف بہانہ کر رہا تھا، ورنہ میری آنکھیں تو سامنے پیلس سینما کے بس اسٹینڈ پر جمی تھیں۔ جہاں کئی لڑکیاں کھڑی آپس میں کسی بات پر زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ ان کی ساڑیوں کے مختلف رنگوں نے اس سلونی شام میں رنگینی چھڑک دی تھی، اور پھر ان کے لطیف، چوڑیوں کی چھنک جیسے قہقہے! میں ان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دو تین کے سوا باقی سب معمولی شکل و صورت کی تھیں۔ کوئی اور دن ہوتا تو میں شاید ان کے دیکھنے پر اتنا وقت صرف نہ کرتا۔ لیکن ادھر کئی دن سے سرلا کی طبیعت خراب تھی۔ گھر سے نکل ہی نہ سکتی تھی۔ شیلو اور للی بمبئی چلی گئی تھیں، اور رینی کی شادی ہو گئی تھی۔ میری شامیں بالکل اداس اور ویران گذر رہی تھیں۔ آج بڑی مشکل سے تھیلما سے شام کے پکچر کا وعدہ ہوا تھا۔ لیکن ابھی صرف پانچ ہی بجے تھے اور وہ ساڑھے پانچ بجے مجھے عابد روڈ پر ملنے والی تھی۔

"کاجو .... بابوجی .... نمکین کاجو........" کاجو بیچنے والا بچّہ کان کے قریب سے چلایا۔

"نہیں" میں نے چونک کر جواب دیا۔

"صرف ایک روپے میں پیکٹ" وہ اور آگے بڑھا۔ اس کے غلیظ میلے ہاتھوں میں کاجوؤں کا ڈبّہ دیکھ کر گھن آنے لگی۔

"مجھے نہیں چاہیے۔" میں نے کہا

"بڑے عمدہ ہیں بابوجی ..... صرف ایک روپے میں ..... لے لیجئے۔"

وہ اس طرح کہنے لگا جیسے کا جو نہیں بیچ رہا بلکہ بھیک مانگ رہا ہو۔ میں چپ رہا۔

"لے لیجئے۔ آج صبح سے ایک بھی نہیں بکا ..... ماں گھر پر بیمار پڑی ہے اور اس نے اور میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے اور بابوجی .... میرا باپ ......"

اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ گلا بھر آگیا .... میرا دل رحم کے بے پایاں سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

اخبار موڑ کر بغل میں دباتے ہوئے میں یونہی وقت کاٹنے دیکا جی رسٹورنٹ کی طرف جانے لگا۔ شام کی چہل پہل کافی بڑھ چکی تھی۔ بڑی مشکل سے سڑک عبور کر کے میں دوسری جانب جانے لگا۔ سڑک عبور کرتے ہوئے ایک دومنزلہ بس سے کسی نے جلتا ہوا سگریٹ میرے گال پر پھینک مارا۔ معلوم نہیں اتفاقاً یا قصداً۔ لیکن میں درد سے تڑپ اٹھا۔ پھینکنے والے کو ایک موٹی سی گالی دے کر میں نے گال رگڑ ڈالا۔ سڑک پار کر کے میں ایک جگہ ٹھہر گیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ تھیلما پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ کتنا کہا تھا کم بخت سے کہ پانچ بجے ہی آجائے۔ مگر وہ نہ مانی۔

"ایک پیسہ .... اللہ نام کا ..... ایک پیسہ" پیچھے سے ایک بھکاری چیخ پڑا۔ میں نے مڑ کر نظر ڈالی تو وہ پھر آگے آگیا۔ بیمار، کمزور، ساٹھ ستر برس کا بوڑھا تھا۔ آنکھوں میں بھوک، فاقے اور بے کسی جھلک رہی تھی۔

"ایک پیسہ ..... صاحب ..... بس ایک پیسہ۔"

جب وہ آگے بڑھ گیا تو میں سوچنے لگا۔ یہ فقیر اس وقت بھی ایک پیسہ مانگتے تھے جب ایک پیسہ واقعی ایک پیسہ تھا اور آج بھی وہ ایک ہی پیسہ مانگتے ہیں جب کہ ایک پیسہ اپنی ساری قیمت کھو کر غائب ہو چکا ہے!

"آداب عرض ہے"۔ میں چونک پڑا کوئی صاحب بڑے ادب اور خلوص سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

"آداب عرض ہے"۔ میں نے کہا اور ہمارے ہاتھ ایک طویل مصافحے میں مصروف ہو گئے۔ آخر انہوں نے میرے پریشان چہرے کو دیکھ کر ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے ..... آپ نے مجھے پہچانا نہیں شائد!"

"جی ...... واقعی بات کچھ ایسی ہی ہے ......" مجھے سخت ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ زیرِ لب مسکرانے لگے۔

"کوئی بات نہیں ...... دراصل میں کسی زمانے میں آپ کا ہم محلہ تھا، جب آپ وہاں ...... اعظم پورہ میں رہتے تھے ...... میرا مکان آپ کے مکان سے دس بیس قدم پرہی تھا ..... اور میرے والد ......"

"ارے آپ ہیں! ..... سچ میں تو بھول ہی گیا تھا"۔ میں نے اخلاقاً کہہ تو دیا لیکن دراصل سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا کہ ان صاحب کو پہلے کہیں دیکھا بھی ہے یا نہیں۔

"آپ مصروف تو نہیں ہیں؟ ... دو چار منٹ تو دے ہی سکیں گے"۔ انہوں نے ایسی بے تکلفی سے کہا کہ اگر دو چار گھنٹے بھی مانگتے تو شائد دینے ہی پڑتے۔

"جی بڑے شوق سے"۔

"بات یہ ہے کہ ..... یعنی آپ ذرا اِدھر تشریف لے آئیں تو آپ سے کچھ کہوں ... . گھبرائیے نہیں ...... کوئی خاص بات نہیں ...... لیکن یہاں بھیڑ بہت ہے"۔ اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر برابر ہی باٹا کی دکان کے سامنے والے موڑ پر لے گئے۔

"آپ وہ رکشا دیکھ رہے ہیں"۔ اور قریب ہی کھڑے ہوئے ایک سائیکل رکشا کی طرف اشارہ کر دیا۔ رکشا پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس لئے سوائے رکشا کے بیرون کے میں کچھ اور نہیں دیکھ سکا۔

"جی ...... دیکھ رہا ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔

"کہنا یہ ہے کہ اس میں ...... ایک خاتون ہیں"۔

"جی؟ ....." میں کچھ گھبرانے لگا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اتنی لڑکیوں سے ملاقات کر چکنے کے بعد بھی ایسے موقعوں پر میں گھبرا جاتا ہوں۔

"ان کی ابھی شادی نہیں ہوئی ..... وہ کافی خوبصورت بھی ہیں .... میری دُور کی عزیز ہیں .... اس لئے اس مصیبت کے وقت ان کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔"

"مصیبت ؟"

"جی ..... گذشتہ ہنگاموں میں ان کا سب کچھ لٹ گیا۔ ان کے والد کہیں گرداور تھے، بے چارے قتل کر دیئے گئے۔ سب سامان لوٹ لیا گیا۔ بھائی کی نوکری چلی گئی .... مفلسی سے تنگ آ چکی ہیں .... کیسی نازوں میں پلی تھیں .... اور آج ..... آہ!"

شائد وہ صاحب رونے لگے تھے۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر کہنے لگے۔

"مگر آپ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔ وہیں تشریف لے جائیے نا! .... آپ سے جیسی ہو مدد فرما دیجئے .... اور سینما تو آپ جاتے ہی ہوں گے۔ یا پھر کوئی ہوٹل رستوران ...... اور یقین مانئے آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"لیکن جناب ..... بات یہ ہے ...... یعنی مجھے اس وقت ایک دوست کا سخت انتظار ہے .... ورنہ .... ورنہ میں۔"

"اس میں کیا مضائقہ ہے! آپ کے دوست بھی ساتھ ہوں گے تو کیا حرج ہے۔ میرا مطلب ہے ......"

"جی نہیں ..... اصل میں وہ میرے دوست بھی ہیں اور بھائی بھی ..... آپ مجھے تو معاف ہی کیجئے۔" کہتے ہوئے میں نے دس روپے کا ایک نوٹ ان کی ہتیلی میں تھما دیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میں وہاں سے کھسک آیا۔ مجھے اب ان صاحب پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ کس طریقے سے اپنے آپ کو چھپانا چاہتے ہیں یہ لوگ! ...... اور مجھے خود اپنے اوپر بھی غصہ آرہا تھا۔ بھلا ان صاحب کو وہ نوٹ کیوں دے دیا؟ اس قدر گھبرا کیوں گیا تھا میں؟ ..... اور پھر ان کی اس عزیزہ پر بھی غصہ آرہا تھا ...... مجھے سب پر غصہ آرہا تھا ..... اور سب سے زیادہ تقیلما پر۔

"ارے ..... رسکِ تم کہاں ؟" اور کسی نے پوری قوت سے میری پیٹھ پر ایک دوہتڑ جما دیا۔ میں اپنے خیالات سے چونک پڑا پلٹ کر دیکھا تو بچپن کا دوست حلیم تھا.....

اور پھر وہیں سڑک پر، بھیڑ کے درمیان، کئی راہ چلتوں کو ادھر ادھر رک جانے پر مجبور کرتے ہوئے ہم دونوں بغل گیر ہو گئے اور جب علٰحدہ ہوئے تو ایک انگریز میم صاحبہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی پاس سے گذر گئیں۔

"کہو یار ...... کس حال میں ہو .... کتنے دن بعد ملے ہو؟" حلیم نے کہا۔

"ٹھیک ہوں .... اور تم؟ تم اتنے دن کہاں رہے؟ کیا کر رہے ہو؟" میں ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھتا چلا گیا۔

"میں مدراس چلا گیا تھا۔ وہاں کچھ کاروبار شروع کیا تھا۔ مگر اب یہاں بینک میں نوکر ہو گیا ہوں .... اور یہاں کب تک کھڑے رہیں گے ...... آؤ اس ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں کریں گے ...... مصروف تو نہیں ہو نا؟"

"نہیں ..... نہیں کوئی ایسی مصروفیت نہیں ہے ......" ہم سامنے والے ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہاتھ پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا پانچ بج چکے تھے۔ پندرہ منٹ بعد مجھے تھیلما سے ملنے بس اسٹینڈ پر جانا تھا۔ میں سوچنے لگا اس حلیم سے کیسے چھٹکارہ ہو گا اتنے دن بعد تو ملا تھا وہ!

یاد ہے ..... ہم اسکول سے بھاگ بھاگ کر اسی ہوٹل میں چائے پینے آیا کرتے تھے۔" ایک خالی میز پر بیٹھتے ہوئے حلیم بولا۔ ہم دونوں ہنس پڑے۔ بچپن کی سی معصوم ہنسی۔

"رسک ..... تم نے شادی کر لی یا نہیں؟" وہ ایکدم میز پر جھک کر پوچھنے لگا۔

"نہیں .... ابھی تک تو نہیں کی"

"اور وہ تمہاری للی کیا ہوئی ...... کیا ابھی تک ..... ؟" اور دانت نکالے وہ بُری طرح ہنسنے لگا۔ مجھے ذرا سی دیر کے لیے اس پر غصّہ آ گیا۔ للی بہت دن ہوئے میری دوستی چھوڑ چھاڑ بمبئی چلی گئی تھی اور سنا تھا وہاں کسی اینگلو انڈین لڑکے پر بری طرح فدا ہو رہی تھی۔ میں حلیم کو بتانے لگا۔

"للی کی شادی زبردستی اس کے چچا زاد بھائی سے کر دی گئی ______"

"ارے سچ سچ .... بے چاری ...... مگر وہ مان کیسے گئی؟"

"میں نے ہی اسے سمجھایا تھا ...... والدین کی مخالفت ٹھیک نہیں ہوتی"۔ اور میں سنجیدگی اور بزرگی کے سارے آثار چہرے پر جمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم ذرا سی دیر چپ رہے۔ ویٹر کو دو کولڈ ڈرنک لانے کے لیے کہہ دیا۔

"اور تم حلیم؟ ..... تم بھی ابھی اکیلے ہی ہو؟" جیب سے سگریٹ اور دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے میں نے پوچھا اور جواب میں حلیم نے ایک لمبا سانس فضا میں چھوڑ دیا۔

"ابھی تک تو اکیلا ہوں"۔ اس نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ پھسلتی چلی گئی۔

"تو ابھی کورٹ شپ ہو رہا ہے"۔ میں مسکرانے لگا۔ لیکن جواب میں وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان کی گہرائیوں میں ضرور کسی کی محبت کروٹ لے چکی تھی۔ آہستہ سے اس نے جیب سے ایک خوبصورت سا سگریٹ کیس نکالا۔ اور اسے کھول کر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ مجھے سخت تعجب ہوا کیونکہ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"اس نے مجھے یہ سگریٹ کیس پریزنٹ کیا تھا ..... اور میں نے اسی دن سے سگریٹ پینا شروع کر دیا ______"

"او ..... تو یہ بات ہے!" میں مسکرانے لگا۔ "مگر وہ کون ہے کچھ بتاؤ گے نہیں؟"

"وہ ایک کرسچین لڑکی ہے۔ ایک دن کسی کام سے بینک آئی تھی۔ وہیں سے ہماری دوستی شروع ہو گئی"۔ اور میں سوچنے لگا۔ ایک سگریٹ کیس دے کر اب تک نہ جانے کتنے روپے اس نے اس نے اس بیوقوف حلیم سے اینٹھ لئے ہوں گے! یہ سب اسی طرح کی ہوتی ہیں اور پھر میں شکیلہ کے متعلق سوچنے لگا .... دو ایک دن میں ہی وہ مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو گئی تھی۔ میری جیب میں بھرے ہوئے نوٹ اسے نظر آ چکے تھے۔ مگر شاید حلیم کی شکیلہ ایسی نہ ہو۔ شاید وہ حلیم سے سچی محبت کرتی ہو اور کسے معلوم ایک دن ان کی زندگیاں خوشبوؤں سے بھر جائیں۔ میں نے سٹرا کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ حلیم اپنے تصورات میں گم تھا۔

"وہ بہت سیدھی سادی، معصوم سی لڑکی ہے رسک۔ کسی اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے اور رسک وہ مجھے بہت پسند کرتی ہے۔ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں ..... بے پناہ محبت۔ وہ روز شام کو مجھ سے کہیں نہ کہیں ملتی۔ کسی ریسٹوران میں، کسی باغ میں، جھیل کے کنارے، سینما میں ...... اور میں اس کے خوبصورت کٹے ہوئے بالوں میں گلاب کا پھول لگا دیتا۔ اور وہ میرے ہاتھ پر اپنا گال رکھ دیتی۔ اور وہ لمس میری روح میں سرایت کر جاتا۔ وقت بہتے بہتے رک سا جاتا اور پھر وہ شرما جاتی ...... اس کے کانوں میں پڑے ہوئے خوبصورت آویزے ہل اُٹھتے ...... اور رسک اس کے سانولے سلونے گالوں کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے جیسے شام کے اندھیرے میں دن رات سے گلے مل رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں اندھیری راتوں کا کاجل اتر آیا ہے۔ وہ ہنستی ہے تو سینکڑوں چوڑیاں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ اور رسک تم اس کو دیکھو گے تو ...... لیکن رسک پچھلی مرتبہ اس نے وعدہ کیا تھا آج میرے ساتھ سینما چلے گی۔ اور اب وقت ہو گیا ہے ...... مجھے معاف کرنا رسک ...... میں اب جا رہا ہوں" اس نے جیب سے بل کے پیسے نکال کر میز پر رکھ دئیے اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

میں کچھ لمحے چپ بیٹھا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حلیم کو اس سے کتنی محبت ہے۔ کیا وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوگی! کیا وہ جانتی ہے حلیم ہر وقت اس کے تصورات میں کھویا رہتا ہے ..... اور پھر میری نظر گھڑی پر جا پڑی۔ ساڑھے پانچ ہو چکے تھے۔ اوہ ــــــ تھیلما۔ میں فوراً ہوٹل سے نکل آیا۔

سڑک پر لوگوں کا ہجوم اور بڑھ گیا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چلا تھا۔ کہیں کہیں دکانوں پر لال، نیلے اور ہرے رنگ کی روشنیوں میں ناموں اور اشتہاروں کے حروف جگمگانے لگے تھے۔ میں بس اسٹینڈ کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ کہیں وہ اکر واپس نہ چلی جائے۔

بس اسٹینڈ ابھی کچھ دور ہی تھا کہ وہ مجھے نظر آگئی، لیکن اس کے ساتھ حلیم تھا۔ میرے قدم وہیں رُک گئے۔ کچھ دیر میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ حلیم کے چہرے پر اب بھی وہی معصوم محبت کے جذبات چمک رہے تھے۔ البتہ تھیلما کچھ گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے کسی کی تلاش ہو۔ اور اب میں سب

کچھ جان گیا تھا۔ شاید مجھ سے وعدہ کرتے وقت اسے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ حلیم سے بھی اسی دن کا وعدہ کر چکی ہے ......

میں بھیڑ میں ایک طرف کو چھپ گیا۔ میں وہاں حلیم کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔

بے چارہ حلیم۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کی تھیلما آج کی شام میرے ساتھ گذارنے والی تھی ......

اور اس کی سانولی سلونی تھیلما کل کی شام کسی اور کے ساتھ ہوگی۔ اس کی آنکھوں کی رات کا کاجل پرسوں کسی اور کے لئے ہوگا۔ اور ...... اور جب کسی دن وہ سب جان جائے گا تو اس کے خوابوں کا تاج محل ٹوٹ پھوٹ کر گر جائے گا۔ شاید پھر کبھی وہ کسی سے محبت نہ کر سکے گا۔

اور جب ایک بس آکر وہاں کھڑے ہوئے تمام مسافروں کو سمیٹ لے گئی تو میں بھی اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔ بس اسٹینڈ خالی تھا۔ وہ دونوں بھی جا چکے تھے۔ مجھے ایک قسم کی راحت، ایک اطمینان سا محسوس ہوا، اور ساتھ ہی ایک تلخی، ایک کڑوا احساس میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔

میں مکانوں اور دکانوں کے پرے تاریکی میں گم ہوتے ہوئے آسمان کو دیکھتا آگے بڑھ گیا۔

"کاجو ...... نمکین کاجو صاحب ...." کوئی میرے کان کے پاس چلّایا۔

"صرف ایک روپے میں ...... صاحب بس ایک روپے میں"

"نہیں"۔ اور میں آگے بڑھ گیا۔ میرے خیالات، میرا شعور اس وقت کہیں اور تھا۔

"صاحب ...... صبح سے ایک پیکٹ بھی نہیں بکا ہے ...... اور گھر پر میری ماں بیمار پڑی ہے ...... اور صاحب۔ میں نے اور میری ماں نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے ...... اور میرا باپ" ——— اور وہ چپ ہوگیا۔ اس کا گلا بھر آیا ...... اس کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک گئیں۔

اور اب میں رک کر اسے گھور رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ مجھے دیکھ کر چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔

▲▲
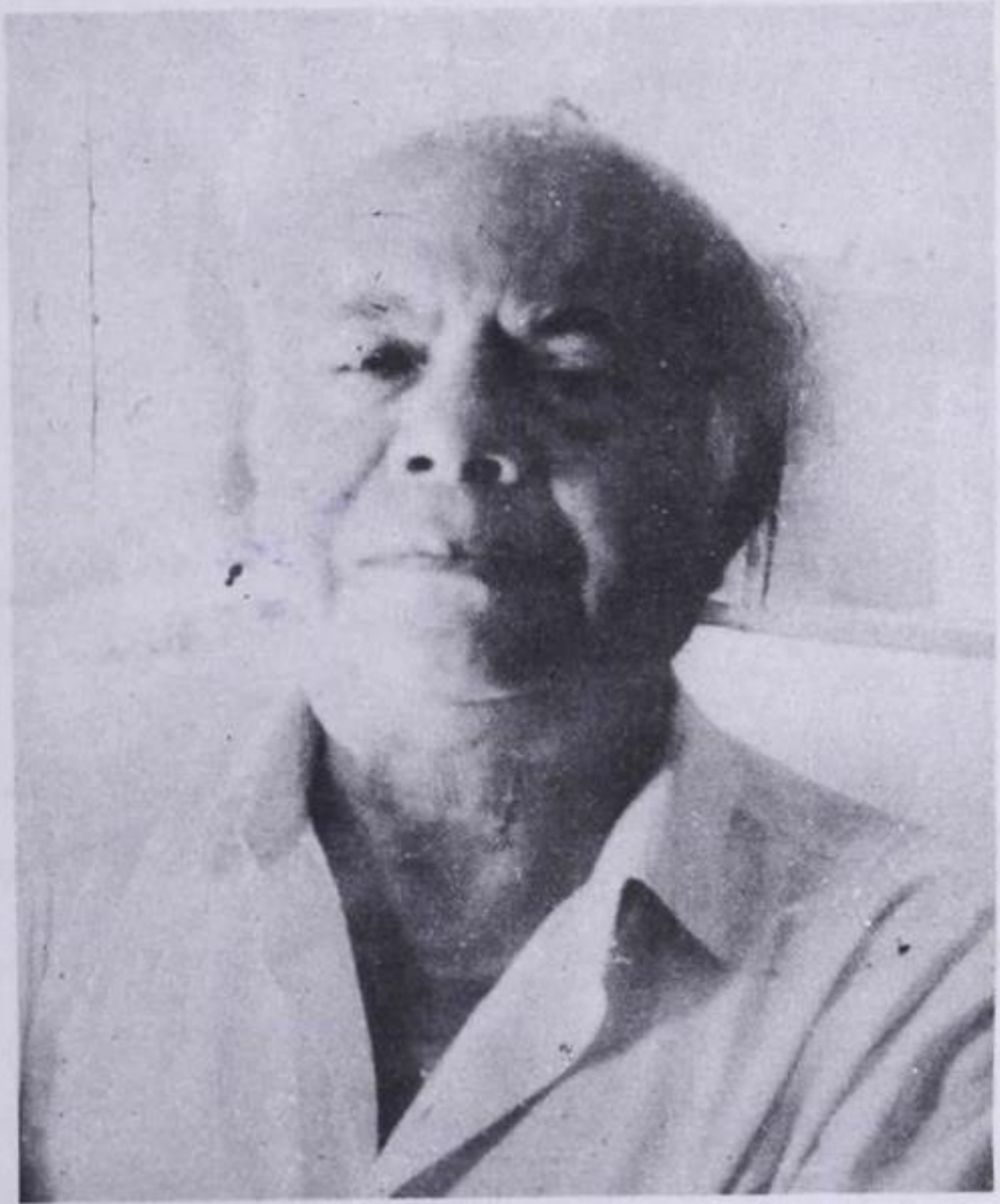
آبائی وطن دِلّی کے قریب پَل وَل ہے۔ ۱۹۲۶ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ مگر بچپن ہی سے حیدرآباد میں رہے، جہاں ان کے والد جناب غلام ربانی صاحب (اردو زبان و ادب کے محقق اور ماہر آثار قدیمہ) ملازمت کے سلسلے میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ یہیں تعلیم مکمل کی۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی سے فزکس میں ایم۔ ایس۔ سی کر کے وہیں لکچرر مقرر ہوگئے۔ ۱۹۸۶ء میں بہ حیثیت ریڈر فزکس ریٹائر ہوئے۔